جلد ۱۱۰ جنوری ۱۹۸۹ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۱۰ | جنوری ۱۹۸۹ء مطابق جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ | عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رابطہ کے لیے: ادارہ ترجمان القرآن، رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار - لاہور

فون نمبر ——— ۶۸۴۴۲۳

زر سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروقی ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

انتخابات کے سیاسی میچ میں جماعتِ اسلامی کی ٹیم کا کھیل کیسا رہا!
اس سوال کا جواب ہم نے پچھلے ماہ کے تبصرہ میں شامل نہیں کیا، بلکہ اس خیال سے مؤخر کر دیا کہ ذرا ٹھنڈی فضا میں ہم اپنے آپ کو تحسینی یا احتسابی نگاہوں سے دیکھ سکیں۔ پھر اگلا کام یہ ہو کہ آئندہ کے لیے نوٹس یا خطوطِ کار تیار کر لیں۔

یہ کام بڑی حد تک مجلسِ شوریٰ اور عاملہ کے اجلاس بلا کر امارت و قیادت نے کر ہی دیا ہے۔

ہم اپنے قارئین کے سامنے یہ صورتِ واقعہ رکھنا چاہتے ہیں کہ جہاں تک امیرِ جماعت کا تعلق ہے انہوں نے ملک و ملت کی بہبود کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی، گفت و شنید کے مراحل طے کیے اور اطراف سے صحت مند ذہن کے اکابر سے تعاون کرتے ہوئے بڑی مدبرانہ صلاحیت کا ثبوت دیا۔ بساطِ سیاست پر انتخابی کھیل کے لیے اسلام اور پاکستان سے تھوڑی بہت نسبت رکھنے والے منتشر مہروں کو اِدھر اُدھر سے اکٹھا کر کے ایک صف کھڑی کر دی۔ ہماری اپنی نظر میں یہ ایک بڑی قربانی ہے کہ ہماری قیادت نے ملک و ملت کے مفاد کو برتر رکھا اور جماعت کے لیے سیٹوں کے حصول کو ثانوی درجہ دیا۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے اور ہم کسی حریفانہ جذبے سے نہیں کہہ رہے، کہ مسلم لیگ جو اپنے اولین دورِ اقتدار (جس میں وہ ہمہ مقتدر رہتی)، کے خاتمے کے بعد[1] اور لمبے دورِ افتراق اور اور آخری زمانۂ اضمحلال

[1] ہماری رائے میں ملک کی بڑی خوش قسمتی ہوتی کہ تحریکِ پاکستان کو چلانے (باقی بر صفحہ آئندہ)

انتشار سے گزرنے کے بعد ایسی حالت کو پہنچ گئی تھی کہ بہت سے منتشر اور ڈھلمل افراد مسلم لیگ کے نام سے انتخابات کے میدان کا رُخ کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ بالعموم ان میں ایسے لوگ تھے، جن کو مختلف مسلم لیگوں کے دائرے سے سوائے مفاد کا ایک ہی زوردار جھونکا پی پی پی کی بزمِ ناز میں پہنچا سکتا تھا۔ "اسلامی جمہوری اتحاد" کے قیام کی وجہ سے نسبتہً بہتر لوگ سامنے آگئے، پھر ان کو ایک مضبوط موقف اختیار کرنا پڑا۔ تب نتیجۃً اتنی کچھ معرکہ آرائی ہو سکی جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں۔ قاضی صاحب کا نقشہ تو یہ تھا کہ جونیجو مسلم لیگ بھی اتحاد میں شامل ہو جائے، نیز مذہبی جماعتوں کے متعلق بھی توقع یہی تھی کہ اہم مصالحِ ملّی کو ملحوظ رکھ کر اور فرقہ وارانہ جکڑبندیوں سے آزاد ہو کر نسبتہً زیادہ قوت بہم پہنچائیں گی۔ مگر مہلتِ قلیل میں وہ سب کچھ نہ ہو سکا جو سوچا تھا۔ اگر مطلوبہ صورت پیدا ہو جاتی تو انتخابی سیاست کا اُونٹ کسی اور کروٹ بیٹھتا۔

تاہم جو کچھ قوت جمع ہو سکی اور جتنا کچھ اتحاد عمل میں آسکا اس کا ماحصل بہت اچھا تو نہیں، مگر بہت برا بھی نہیں۔ مرکز کی مضبوط اپوزیشن، سینیٹ کی اکثریت، ایک غیر جانب دار صدر، پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی اکثریتی حکومت اور سرحد و بلوچستان میں مستقلاً غیر یقینی صورتِ حال کا ہونا، ایسے عوامل ہیں کہ پی پی پی کی حکومت اب کوسِ "انا ولا غیری" بجانے کے قابل نہیں ہے۔

اِس ساری تگ و دو میں ہمارا حصّہ اتنا ضرور ہے کہ مختلف اطراف سے جماعت کی طرف انگلیاں اُٹھا کر

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ)

اور پاکستان کو بنانے والی جماعت ہی اپنے اعلانات اور عوام سے کیے گئے وعدوں اور دُنیا بھر کو سنائے ہوئے نعروں کے عین مطابق یہاں خدا کی اطاعت اور خلق کی خدمت کا صحیح نظام قائم کرتی۔ کاش کہ اُسے عہدوں کی شطرنجی سیاست اور مفاد پرستی کا جادۂ خیانت و کنبہ پروری مسحور نہ کر لیتا۔ اور مزید مبارک صورت یہ ہوتی کہ کامل اجارہ داریٔ اقتدار کے بجائے، وہ نئے مشکل حالات میں ضروریاتِ مقصد کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی ہم مقاصد قوت کا تعاون حاصل کر لیتی۔ مگر ایسا مقدر نہ تھا جس کے بڑے بُرے نتائج بھگتنے پڑے۔ آئندہ بھی کوئی چارۂ کار اس کے سوا نہیں ہے کہ مسلم لیگ نظریہ، مقصد اور کردار کے لحاظ سے اپنے مضبوط آدمیوں کو جمع کر کے کسی جذبۂ دین رکھنے والی ہم مقصد جماعت کے ساتھ تعاون کر کے اپنی تعمیرِ نو کرے

یہ کہا گیا کہ ساری شرارت اس چھوٹی سی قوت کی ہے۔ بی بی سی اور پی پی پی نے بھی ہمیں قصوروار ٹھہرایا۔ ستم یہ کہ مسلم لیگ کے گیلری میں بیٹھے اور سیاست کے بے دخل شدہ بعض بزرگوں نے بھی ہمارے قصور کے تذکرے کو غیظ و غضب کی بلوتی سے خوب مینتا اور رلویا۔ مگر یہ

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

حقیقت یہ ہے کہ ہم تو کچھ بھی نہیں، کسی کے لیے وجۂ پریشانی نہیں — عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

ہم نے تو ملت کی خاطر مسلم لیگ کے بھلے اور خدمت کا کام کیا اور اس میں بھی نام کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بس خاموش کام اور بے مزد کام۔ بلکہ اس خدمت پر سزا بھی قبول!

یہ تو ایک جزوی استثنائی بات ہے، درحقیقت میری نگاہ میں مسلم لیگ کے وہ تمام اکابر اور ارکان بڑی تحسین کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنے ہاں کی بہت بڑی مشکلات کو حل کیا، نشیب و فراز درست کیے، ہمارے تعاون کی قدر کی اور ہماری طرف سے اولاً مسلم لیگ کے اتحاد اور ثانیاً اسلامی جمہوری اتحاد کی مساعی کو نتیجہ خیز بنایا۔ میرا خیال ہے کہ خاص طور پر مسلم لیگ کو اور دوسری جماعتوں کو اور سب سے بڑھ کر مذہبی حلقوں کو ہمیشہ اس پر تیار رہنا چاہیے کہ وہ تعصب و تحزب کی حد بندیاں مٹا کر اعلیٰ ملی مقاصد میں اتحاد کے لیے تیار رہیں۔ یہی کامیابی اور سلامتی کی راہ ہے۔

اب میں اپنے محبتوں اور عزیز ہمسفروں کی طرف روئے سخن کر کے ایک اہم مسئلے کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ مجھے بعض خطوط سخت الفاظ و انداز میں ایسے موصول ہوئے ہیں جن میں یہ اعتراض اٹھایا گیا ہے کہ اتحاد کی خاطر اسلامی معیار سے کم تر لوگوں کو ووٹ دینے کے لیے ہمیں جس مجبوری میں ڈال دیا گیا ہے وہ ناقابلِ فہم یا ناقابلِ برداشت ہے۔ یہ دلیل تک سامنے آئی کہ نص جسے نبی اور صحابہ اور اکابر علماء تک منسوخ یا تبدیل نہیں کر سکتے اسے ہمارا ایک وقتی انتخابی اتحاد بدل کے رکھ دیتا ہے۔ پھر کیا ہم ایک آدمی کے متعلق اقتدار کا اہل ہونے کی غلط شہادت دے سکتے ہیں؟

میں نے ان اعتراضات اور دلائل کا وزن محسوس کیا بلکہ خود بھی سخت ناگواری کے ساتھ اپنا ووٹ ایسے ہی ایک امیدوار کو دیا۔ خدا کا فضل ہے کہ ہماری جماعت میں اس طرزِ فکر کے اصحاب

موجود ہیں، یہ نہ ہوں تو زمین بنجر ہو جائے۔

لیکن بڑے معاملات میں بعض بڑے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب معمول کے احکام سے نہیں مل سکتا۔ ہماری تگ و تاز ملک و ملت کو بہت بڑے خطرات سے بچانے کے لیے تھی اور ہم امریکی سامراج اور روسی و بھارتی دخل اندازیوں سے تحفظ ایک متحدہ قوت سے کرنا چاہتے تھے، ورنہ ہمارے لیے مصیبت اور تباہی کی بعض لاینحل صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔ الگ الگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں (اور ان سب کو ایک خط پر جمع نہ کیا جا سکا) کے بس کا یہ روگ نہ تھا کہ وہ سروں پر معلق مصیبتوں کے بادل سے نمٹیں۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ سابق صدر کے رخصت ہونے کے بعد سے امریکی نفوذ خاص طور پر بڑھنے لگا۔ اور سفارت کی آخری حدود احتیاط سے گزر کر انتخابات سے پہلے اس نے پی پی پی کی قیادت سے گہرے روابط پیدا کیے۔ انتخابات کے سارے ہنگامے میں ایک طرف پورے مغربی پریس اور ذرائع ابلاغ کو پاکستانی انتخابات کے متعلق ایک خاص لائن پر لگا دیا، دوسری طرف اس کے سفارت کاروں نے پی پی پی کی لیڈر شپ اور ذمہ دارانِ حکومت سے کھلم کھلا میل جول رکھا، پریس کلبوں میں شرکت کی، پارٹی کی پریس کانفرنسوں اور دوسری میٹنگز میں حصہ لیا۔ علاوہ ازیں بیرونی فنڈ کے استعمال ہونے پر بھی پریس میں تذکرے رہے۔ اسی گرماگرمی میں یہودی افراد بھی برسوں سے قائم شدہ قید کو توڑ کر ہمارے ہاں آگھسے۔ روس اور بھارت کی بھی خاصی اثر اندازی سامنے آتی رہی۔

ہمارے دوستوں اور دشمنوں کی اس ساری چلت پھرت کے دوران میں ایک سازش تو "ہانگ کانگ پلان" کی ابھر کر سامنے آئی جس کا مقصد صرف کراچی کو آئندہ کا ہانگ کانگ بنانا ہی نہ تھا، بلکہ ملک کے ٹکڑے مختلف شکاریوں کو تقسیم کرنے کے ارادے تھے۔ دوسرا خطرناک منصوبہ چین اور پاکستان کے درمیان ایک چھوٹی سی الگ ریاست بنانے کا معلوم ہوا جہاں اس وقت ایک خاص قسم کی اقلیت کا تشویشناک قبضہ ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہماری ایک سرحد پر ہندو اقلیت بیٹھی ہے، دوسری بڑی سرحد پر عیسائی اقلیت ہے اور تیسری سرحد پر اسمٰعیلی اور شیعہ گروہ ہیں۔ گلگت چترال کے علاقے میں الگ حکومت بنائے جانے کا خفیہ منصوبہ چند ہفتے پہلے فاش ہو چکا تھا۔ اور اب اس سلسلے میں بڑے بڑے بیرونی کارندوں کو ناپسندیدہ قرار دے کر واپس بھجوایا جا رہا ہے۔ لیکن ان افراد

کے ادل بدل سے سازش کی ڈوریاں تو نہیں کٹ سکتیں۔ سیاچین گلیشیر پر بھارتی جارحیت کا تعلق بھی اسی سازش سے ہے جس کا مقصد پاکستان اور چین کے زمینی اور فضائی رابطے منقطع کرنا ہے۔

برادرانِ مسلک! ایسے سنگین حالات میں جب کہ پاکستان پر ہر اطراف سے میزائیل نشانہ باندھے ہوئے ہیں، ملک و ملت کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ جیسی بھی قوت جمع ہوکر دیوارِ مزاحمت بن سکے اس کا فوری انتظام کیا جائے۔ حاصل شدہ قوت اگرچہ حسبِ معیار نہیں ہے، مگر ایک اچھی قوتِ مزاحم بن سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کے افراد روپے، پیسے، پلاٹوں اور وزارتوں کی خریداری کے لیے منڈی میں اپنے ضمیروں کو سکے بنا کر نہ لے جائیں۔

اب شرعی معیارات پر اس مسئلے کے تقاضوں کو جانچنے کے لیے اس مفروضے پر غور کیجیے کہ اگر کسی طرح یہ ممکن ہوتا کہ چند غلط الفکر یا کج کیش لوگوں کو ووٹ دینے یا نمائندہ لیڈر بنانے سے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو روکا جاسکتا تو فتویٰ کیا ہوتا۔ آیا چند غلط افراد کو ووٹ دینے کے گناہ سے بچنے کے لیے ملک کے ایک حصے کو ضائع کرا دینا درست ہوتا؟ یہی صورت اب ہے۔ کیا آپ اپنے ایمان و تقویٰ کے معیار کی سلامتی کے لیے یہ بات قبول کریں گے کہ پاکستان کسی سازش کا شکار ہو جائے۔ اور اسے بچانے کے لیے محبانِ اسلام اور خادمانِ پاکستان کی سرے سے کوئی متحدہ طاقت ہی نہ ہو بلکہ منتشر افراد سوکھے پتوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اُڑنے کے لیے تیار رہیں۔ یہ ایک خاص ملی و اجتماعی حالتِ خطرہ و اضطرار ہے، اس پر کیا حکم لگایا جائے گا۔

جماعت اور اس کی قیادت کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تین اہم نکات پر مختلف جماعتوں اور ان کے افراد کی خاصی تعداد کو جمع کر لیا۔ پہلا نکتہ نفاذِ اسلام، دوسرا نکتہ حمایت و امدادِ جہادِ پاکستان (اور اس سلسلے میں رواں پالیسی کا تحفظ) اور تیسرا نکتہ تحفظِ سالمیتِ پاکستان و نظریۂ پاکستان۔

نہایت ہی ابتر حالات، مخالفین کی فتنہ گری اور وقت کی قلت کے باوجود اتنے کام کا ہو جانا کوئی معمولی واقعہ اور ادنیٰ خدمت نہیں ہے کہ جس کی قدر و قیمت محض اس وجہ سے ہماری نگاہوں میں گر جائے کہ فکر و عمل کے لحاظ سے بعض کمزور افراد کو ووٹ دینے کی آزمائش سے ہمیں گذرنا پڑا۔ میرا خیال ہے کہ اب معترض دوست بہ آسانی مسئلے کو سمجھ سکیں گے۔

ہماری انتخابی مہم کے کمزور پہلوؤں میں سے ایک کراچی کا مسئلہ ہے، جس کی انتخابی سیاست کا جہاز ایم کیو ایم کے ظہور سے قبل ہی پانی کی سطح سے نیچے جا رہا تھا۔ قوت کا ایک مظہر کارپوریشن میں ہماری پوزیشن تھی، اُسے اقتدار والوں نے غت ربود کر دیا۔ رہی سہی رمقِ قوت حالیہ انتخابات میں ختم ہو گئی۔ اِس معاملے میں میری شدتِ احساس اس وجہ سے ہے کہ میں کراچی کے طریقۂ کار اور وسعتِ کار کو پاکستان بھر کے لیے نمونہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ بڑے کرب کے ساتھ میں اس مسئلے پر برابر غور کرتا رہا ہوں اور مجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کئی سال میں نہایت نمایاں شخصیتوں اور جنوں کیش کارکنوں نے علمی، تعلیمی، صحافتی، سیاسی اور خدمتی دائروں میں پوری جان کاہی سے جو کام کیا ہے، وہ اِتنا زیادہ بے اثر ثابت کیوں ہوا۔ جیسے کسی پودے کی جڑ ہی نہ ہو اور اُس کو اُچک کے کوئی پرے پھینک دے۔ کیا وجہ ہے کہ ہمارے ساتھ کام کرنے والے نوجوانوں میں اتنا ایمان اور تحریکی شعور نہ پیدا ہو سکا کہ وہ اپنے مشن کے علاوہ ہر دوسری وجۂ کشش کو اپنے اُوپر اثر انداز نہ ہونے دیتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کو صحیح طریق سے دعوت نہیں ملی۔ بلکہ جلسوں اور افراد کے اچھے تکلم اور رویوں سے سرسری طور پر وہ آگے بڑھے اور پھر ساتھ چلنے لگے۔ ان کو بغور ضروری اور بنیادی لٹریچر کا مطالعہ کرنے اور اس سے پیدا ہونے والے سوالات پر بزرگوں سے تبادلۂ خیالات کا موقع نہیں ملا۔ انہوں نے قرآن و حدیث کے مطالعہ سے بھی نہایت قطعی اور مخصوص اصولوں اور حکمتوں کو اخذ کر کے گردوپیش کے حالات و مسائل پر چسپاں کرنے کا تجربہ نہیں کیا، بلکہ احکام کو حالات پر چسپاں کرنے والے اکابر کی محض تقاریر سُنیں۔ مثلاً یہی کلیہ اگر کسی نے پلّے باندھ لیا ہو کہ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ تو اس سے سرشار ہونے والا شخص دوسری تمام نزاعات اور دلچسپیوں سے اپنی توجہ بالکل ہٹا لیتا ہے اور سیدھا قرآن و سنت سے روشنی لیتا ہے، جیسے کہ جماعتِ اسلامی کی تشکیل کرنے والوں نے کیا تھا اور جیسا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کی دعوتِ حق کو قبول کرنے والوں کا ذہن تھا۔ اندیشہ ہے کہ کہیں بعضوں کا نرا سیاسی رنگ اختیار کر جانا، ان میں دینی رُوح کا کم تر ہو جانا، حالات و اشخاص کو موضوع بنائے رکھنا اور لمحہ بہ لمحہ اُبھرنے والے رجحانات کے لیے جواز کی راہیں نکالنا، خرابیِ احوال کا سبب نہ ہو۔ ایسا سوچنے پر دل تیار نہیں ہوتا۔ اور کراچی کے اکابر و عمائد کے ایمان و قابلیت پر مجھے بڑا اعتماد رہا ہے۔ بہرحال وجہ جو کچھ بھی ہو، میرا یہ سوال دماغ سے نکلتا نہیں کہ کیوں نہ ایسا ہو سکا

کہ کراچی کے محلے محلے میں نہایت مضبوط بزرگوں اور نوجوانوں کے پاکٹ قائم ہو جاتے جن میں کسی کو کوئی لالچ اور کوئی دوسرا مقصد اور کوئی نیا نعرہ کھینچ نہ سکتا، بلکہ وہ دوسرے لوگوں کو اپنے سایے میں جگہ دے کر خون خرابے کی لہروں سے بچالیتے۔ یہ بات میرے ذہن میں خاص طور پر اس دن سے اُبھری جس دن کسی اسمٰعیلی یا بوہرے کا یہ بیان سامنے آیا تھا کہ کراچی کے جس علاقے میں ہمارا اثر ہے وہاں جس دن ہم نے اپنا اُمیدوار کھڑا کیا اُس دن کوئی طاقت ایک کروڑ روپیہ خرچ کر کے بھی ووٹروں پر اثرانداز نہ ہو سکے گی اور وہ اُمیدوار لازمی طور پر فاتح ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اگر عرصہ کار کو دیکھا جائے تو آج پورے کراچی کو اس مقام پر ہونا چاہیے تھا کہ جماعت چیلنج کر کے کہہ سکتی کہ آؤ اور اس شہر میں ہم سے انتخابی مقابلہ کر کے کوئی سیٹ جیت کر دیکھو۔ پورا کراچی نہ سہی، اس کے دو چار مضبوط حلقے اس حیثیت سے ضرور ہونے چاہییں تھے۔ بلکہ میرا تو خواب یہ رہا ہے کہ پاکستان بھر میں چند اضلاع اور چند حلقے پوری طرح جماعتِ اسلامی کے زیرِ اثر ہوتے۔

بہرحال ایک خیر خواہ یہ عرض کرتا ہے کہ معاملہ چند تقریروں اور کسی طرح کی قرارداد کا نہیں، بلکہ ضرورت ایک ایسے بورڈ یا کمیشن کی ہے جو تفصیلی حالات کا تجزیہ کر کے رپورٹ تیار کرے اور آئندہ کے کام کے لیے خطوط معین کرے۔

دوسرا مسئلہ سندھ کا ہے۔ سندھ میں اسلامی جمہوری اتحاد ہی خالی ہاتھ رہا تو جماعتِ اسلامی کو کیا ملتا۔ لیکن ہمارے لیے سوال یہ سامنے آتا ہے کہ بنگلہ دیش کا معاملہ جس نوبت کو پہنچا وہ تو پہنچا، مگر بنگلہ میں لٹریچر کے تراجم کر کے کام کو کارکنوں نے اتنا پھیلایا ہے کہ علیحدگی سے قبل کے انتخابات میں پورے صوبہ میں جماعت کے اُمیدوار مجموعی طور پر سیکنڈ پوزیشن میں آئے، اور آج تو اُن کی طاقت اچھی طرح محسوس ہو رہی ہے۔ اگر محمد بن قاسم کے قدموں تلے آنے والی مبارک سرزمین میں پچھلے   اس طرح دعوت اور لٹریچر کو پھیلانے کی دوگونہ مہم چلتی تو آخر وہاں اولادِ آدم ہی تو بستی ہے جس کی اکثریت کلمہ اسلام پڑھتی ہے، وہ لوگ آخر اینٹ پتھر تو ثابت نہ ہوتے۔

میں اس سے زیادہ کچھ بحث نہیں کر سکتا کہ سندھ کے حالات کو سمجھنے والے جماعتی دانشوروں کا کوئی کنونشن ورکشاپ طرز کا، جمع ہو کر نقشۂ کار طے کرے۔

صوبہ سرحد میں بھی ہماری پوزیشن بحیثیت جماعت اور بہ حیثیت آئی جے آئی پاس مارکس سے بہت

نیچے رہی۔

بلوچستان کا معاملہ بھی سنجیدہ ہے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ انتخابات کے تقاضوں کے دباؤ اور مقابلے کی کشمکش میں آکر ہم نے دینی اثرات کو کمزور تو نہیں ہونے دیا۔ ورنہ اپنے اُصولوں اور روایات (خصوصاً نسوص) کے خلاف کوئی حرکات تو نہیں ہوئیں۔ یہ بھی ایسا معاملہ نہیں کہ اسے سرسری طور پر سامنے لاکر چھوڑ دیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ مجلسِ شوریٰ نے اس سلسلے میں تفصیلی چھان بین اور کارروائیوں کا فیصلہ کیا ہے۔

اصل اور سب سے بڑا مسئلہ[1] یہ ہے کہ ہمارا اصل کام لادینیت (اس کی مختلف شکلوں) کو شکست دینا اور دین کے اُصول و اقدار کو غالب و برتر کرنا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو قابلِ غور امر یہ ہے کہ آج لادینیت نے بہت ہی نمایاں طور پر پیش قدمی کرلی ہے اور ہم لوگوں کے دینی مورچے بہت پیچھے ہٹا دیئے گئے ہیں۔ ہماری جو پوزیشن قبلِ تقسیم تھی، آج شاید وہ بھی نہیں رہی۔ لیکن یہ تو حقیقت ہے کہ قراردادِ مقاصد پاس ہونے کے زمانے میں اور ۲۲ نکات طے ہونے کے وقت اور ۱۹۵۶ء کا دستور بننے کے وقت تک بھی جماعت کے قلیل التعداد اور قلیل الوسائل ہونے کے باوجود معاشرے میں ہمارا وزن بہت زیادہ تھا۔ ۱۹۵۸ء میں ہمیں جب اچھی طرح استبداد میں کسا گیا ——— تب بھی ہماری حیثیت برتر تھی۔ صدر ایوب کی آمریت نے جب پاکستان کے دستوری نام سے لفظ اسلامی اُڑانے کی کوشش کی تو اُسے سخت ناکامی ہوئی۔ اس زمانے تک رویت ہلال تک کے معاملات میں دینی محاذ کا فیصلہ

---

[1] اس مسئلے کا تعلق نہ صرف حالیہ انتخابات سے ہے، نہ موجودہ یا کسی سابق دورِ قیادت سے، نہ شوریٰ سے اور نہ کسی خاص فرد سے۔ بلکہ یہ تو تحریکی بہاؤ ہے جس کے لمبے دور میں غیرشعوری اور غیرارادی طور پر بعض بے چھوٹے چھوٹے موڑ پیدا ہوئے ہیں یا ساحل کٹتے رہے ہیں، یا خس و خاشاک موجوں پر سوار ہوتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے ہمارے کام میں خلل آیا ہے۔

سرکاری اعلانات پر ہمیشہ غالب آنا تھا۔

اب جو تبدیلیاں بوجہ لادینیت و اباحیت اُبھر کر سامنے آئی ہیں، نیز معاشرے کے بگاڑ کے جو نئے سر و سامان ہو رہے ہیں اور نفاذِ اسلام کی راہ میں جو نئے حالات مستزاد ہو رہے ہیں، اُن پر مجھے گفتگو کرنی ہے۔ تاکہ ہم ۴۷ سالہ تگ و تاز کے مقابل میں ماحصل پر نظر ڈال کر نئے خطوطِ کار کو اجاگر کر سکیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے خوشنویس صاحب اس سے زیادہ لکھنے کے لیے صفحات میں گنجائش نہ ہونے پر توجہ دلا رہے ہیں۔ لہٰذا:

(باقی آئندہ)

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گذارش ہے کہ جن اوراق پر آیات و احادیث ہوں، ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں۔

(ادارہ)

حکمتِ سیّد مودودیؒ

امتحان اور ہماری ذمہ داری

(ادارہ)

(۱)

"جماعتِ اسلامی محض ایک سیاسی جماعت نہیں - وہ ایک نظریاتی تحریک ہے اور انتخابات اِس کے کام کا ایک حصہ ہیں — ہم نے نہ پہلے کبھی انتخابات پر انحصار کیا ہے اور نہ آئندہ انتخابات پر انحصار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جماعتِ اسلامی کی تاریخ آپ کے سامنے ہے - آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تئیس سال تک اِس ملک میں عام انتخابات نہیں ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود جماعتِ اسلامی کی دعوت کو ملک کے ہر گوشے میں فروغ حاصل ہوا ہے - موجودہ انتخابات کے زمانے میں گذشتہ چھ ماہ کے اندر ہم نے خدا کے فضل سے اتنا تحریکی کام کر لیا ہے جو ہم ۲۳ سال میں بھی نہیں کر پائے تھے - اِن شاء اللہ یہ کام انتخابات کے نتائج کے علی الرغم ہمارے لیے بہت تقویت کا باعث بنے گا۔"

(دسمبر ۱۹۷۰ء کی ایک مجلس میں مولانا مودودیؒ کے ارشادات)

(۲)

"ہمارا کام قوم کے بگاڑ میں اضافہ کرنا نہیں، بلکہ اس بگاڑ کو دُور کرنا ہے - ہم نے اوّل روز سے شرافت اور اخلاق کے جس معیار کو اپنایا ہے اس کو ترک کرنے کے ہم کسی طرح روادار نہیں ہیں خواہ بگڑے ہوئے طبقہ میں سے ایک فرد بھی ہماری طرف متوجہ نہ ہو - ہمارے پاس صرف شرافت اور

اخلاق کا مال ہے ۔ بدمعاشی، بے حیائی اور غنڈہ گردی کا مال نہیں ہے ۔ یہ مال جو لوگ پسند کرتے ہیں، انہیں دوسری دوکان ہی مبارک ہو۔"

(۱۹۷۰ء کی ایک مجلس میں مولانا مودودیؒ کے ارشادات)

(۳)

"ایمان دار لوگوں پر انتخابات کے نتائج سے کوئی اثر نہیں پڑتا ۔ مایوسی اور ایمان کبھی یک جا نہیں ہو سکتے ۔ ہمارا فرض ہے کہ خدا کی سیدھی راہ میں کام کئے جائیں ۔ خود حق پہ رہیں اور اہلِ حق کا ساتھ دیتے رہیں اور نتائج کو خدا پر چھوڑ دیں ۔ اُسی کا دین ہے اور اُسی کا ملک ۔ وہ جو بہتر سمجھے گا، کرے گا۔"

(۱۹۷۰ء کی ایک مجلس میں مولانا مودودیؒ کے ارشادات)

(۴)

"جماعتِ اسلامی اپنے نام اور اپنے ہی پروگرام کے مطابق کام کرے گی ۔ وہ کسی کی خوشنودی کی خاطر یا فتح اور کامیابی کی لالچ میں اپنے پروگرام کو نہیں بدلے گی ۔ آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں ۔ آخر کار لوگ ہماری بات ضرور مان لیں گے اور باطل کا ساتھ چھوڑ کر حق کا ساتھ دیں گے۔"

(۱۹۷۰ء کی ایک مجلس میں مولانا مودودیؒ کے ارشادات)

(۵)

"اِس حقیقت کو آپ جان لیں تو یہ بات بھی سمجھ میں بخوبی آ سکتی ہے کہ اہلِ حق کی اصل ذمہ داری یہ نہیں ہے کہ وہ باطل کو مٹا دیں اور حق کو اس کی جگہ قائم کر دیں ۔ بلکہ ان کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی حد تک باطل کو مٹانے اور حق کو غالب و سربلند کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ صحیح اور مناسب و کارگر طریقوں سے کوشش کرنے میں کوتاہی نہ کریں ۔ یہی کوشش خدا کی نگاہ میں ان کی کامیابی و ناکامی کا اصل معیار ہے ۔ اِس میں اگر ان کی طرف سے دانستہ کوئی کوتاہی نہ ہو تو خدا کے یہاں وہ کامیاب ہیں ۔ خواہ دُنیا میں باطل کا غلبہ اُن کے ہٹائے نہ ہٹے اور شیطان کی پارٹی کا زور اُن کے

توڑے نہ ٹوٹ سکے"۔ (جنوری ۱۹۷۱ء میں مولانا مودودیؒ کا کارکنوں سے خطاب)

(۶)

"حق پرستوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق کو غالب کرنے کے لیے کہاں تک جان لڑاتے ہیں۔ عام انسانوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق کے علمبرداروں کا ساتھ دیتے ہیں یا باطل کے علمبرداروں کا اور باطل پرستوں کا امتحان اس میں ہے کہ وہ حق سے منہ موڑ کر باطل کی حمایت میں کتنی ہٹ دھرمی دکھاتے ہیں۔ اور حق کی مخالفت میں آخر کار خباثت کی کس حد تک پہنچتے ہیں۔ یہ ایک کھلا مقابلہ ہے جس میں اگر حق اور راستی کے لیے سعی کرنے والے پٹ رہے ہوں تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حق ناکام ہو رہا ہے اور اللہ تعالیٰ خاموشی کے ساتھ اپنے دین کی مغلوبی کو دیکھ رہا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حق کے لیے کام کرنے والے اللہ کے امتحان میں زیادہ سے زیادہ نمبر پا رہے ہیں۔ اُن پر ظلم کرنے والے اپنی عاقبت زیادہ سے زیادہ خراب کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اور وہ سب لوگ اپنے آپ کو بڑے خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ جو اس مقابلے کے دوران میں محض تماشائی بن کر رہے ہوں یا جنہوں نے حق کا ساتھ دینے سے پہلو تہی کی ہو یا جنہوں نے باطل کو غالب دیکھ کر اس کا ساتھ دیا ہو"۔

(جنوری ۱۹۷۱ء میں مولانا مودودیؒ کا کارکنوں سے خطاب)

(۷)

"خدا کی اس کھلی امتحان گاہ میں کافر، مومن، منافق، عاصی اور مطیع سب ہی ہمیشہ اپنا امتحان دیتے رہے ہیں اور آج بھی دے رہے ہیں۔ اس میں فیصلہ کن چیز کوئی زبانی دعویٰ نہیں، بلکہ عملی کردار ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھی مردم شماری کے رجسٹر دیکھ کر نہیں بلکہ ہر شخص کا، ہر گروہ کا اور ہر قوم کا کارنامہ سعیات دیکھ کر ہی ہوگا"۔

(جنوری ۱۹۷۱ء میں مولانا مودودیؒ کا کارکنوں سے خطاب)

اَسْمَاءُ الْقُرْآن

جناب محمد رفیق صاحب ۔ منصورہ ۔ لاہور

قرآن مجید نے اپنی گوناگوں اور مختلف حیثیات کے پیشِ نظر اپنے لیے بعض ایسے صفاتی نام تجویز کیے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنا تعارف کراتا ہے اور جس کے نتیجے میں اس کا عظیم مرتبہ و مقام واضح ہوتا ہے ۔

اس ضمن میں اگرچہ لفظِ " قرآن " کی لغوی بحث میں کئی اقوال ملتے ہیں تاہم اس لفظ کی حیثیت بھی اسمِ علم یعنی اس کے اصل نام کی ہوگئی ہے ، کیونکہ بعض دوسری الہامی کتابوں مثلاً توریت اور انجیل (جو کہ اب لفظی اور معنوی طور پر محرف ہو چکی ہیں) کے اسماء کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری کتاب کے لیے جو نام اختیار کیا ہے وہ قرآن ہی ہے ۔ سورۂ توبہ میں ہے کہ :

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ (سورہ توبہ ۔ آیت ۱۱۱)

بے شک اللہ نے اہلِ ایمان سے خرید لیا ہے ان کی جانوں کو اور ان کے مالوں کو اس کے عوض میں کہ انہیں جنت ملے گی ۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں تو کبھی قتل کر ڈالتے ہیں اور کبھی قتل ہو جاتے ہیں ۔ اس پر ہمارا ایک سچا وعدہ ہے توریت میں ، انجیل میں اور قرآن میں ۔

پھر اس کتابِ الٰہی کے تمام اسماء میں بھی سب سے زیادہ قرآن ہی کا نام مذکور ہوا ہے ۔ بالکل اسی طرح جس طرح اسمائے حسنیٰ میں " اللہ " کا نام ہی قرآن مجید میں سب سے زیادہ مرتبہ وارد ہوا ہے ۔

قرآن مجید نے اپنے لیے جو اسماء و القاب اختیار کیے ہیں۔ اُن کو ہم اس مضمون میں حروف تہجی کے اعتبار سے بیان کریں گے اور ہر ایک نام کے تحت صرف ایک ہی حوالے پر اکتفا کریں گے تاکہ طوالت پیدا نہ ہو۔

اَحْسَنَ الْحَدِیْث قرآن مجید کا ایک صفاتی نام "احسن الحدیث" ہے جس کے معنی ہیں "بہترین کلام"، "عمدہ ترین بات"، "سب سے اچھی بات"۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی کلام بہترین اور عمدہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ اس خالقِ کائنات کا کلام ہے جس کا کوئی شریک و سہیم اور ثانی نہیں ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ	اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے، ایک
كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ	کتاب، باہم ملتی جلتی اور بار بار دہرائی ہوئی،
تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ	اس سے اُن لوگوں کی جلد کانپ اُٹھتی ہے جو
يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ	اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔

(الزمر۔ آیت ۲۳)

اَمر قرآن مجید کا ایک نام "اَلْاَمْر" ہے جس کے معنی "حکم" کے ہیں۔ قرآن مجید ان معنوں میں "اَلْاَمْر" ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے احکام بیان ہوئے ہیں جن کی تعمیل اور اطاعت کرنا اس کے بندوں پر فرض ہے۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗ	یہ حکم ہے اللہ کا جو اس نے تمہارے
اِلَيْكُمْ۔ (الطلاق۔ آیت ۵)	پاس بھیجا ہے۔

بُرہان قرآن مجید کی ایک صفت "البرہان" ہے جس کے معنی ہیں مضبوط اور روشن دلیل، حجتِ قاطع، ہر حال میں سچی دلیل۔ قرآن مجید کے البرہان ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ حجتِ قاطع ہے۔ ہر شبے کا ازالہ، ہر اعتراض کا جواب اور ہر سوال کا تشفی بخش جواب ہے۔ یہ اپنی دلیل آپ ہے اور ع

آفتاب آمد دلیلِ آفتاب

والی بات ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ	اے لوگو! تمہارے پاس یقیناً ایک دلیل

بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ	تمہارے رب کی طرف سے آ چکی ہے اور
اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝	ہم نے تمہاری طرف ایک کھلا ہوا نور بھیجا ہے۔

(النساء - ۱۷۴)

بشریٰ | "بشریٰ" بھی قرآن مجید کا ایک نام ہے، جس کے معنی "خوش خبری" کے ہیں۔ قرآن مجید کے "بشریٰ" ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو جنت کی بشارت دیتا ہے۔ وہ اُن کو اُن کے اچھے اعمال کے بہتر بدلے اور ثواب کی خوش خبری سناتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ	اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے۔
تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى	ہر بات کو کھول دینے والی اور اہلِ اسلام
وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝	کے حق میں ہدایت اور رحمت اور خوشخبری ہے۔

(النحل - ۸۹)

بشیر | "بشیر" بھی قرآن مجید کے ناموں میں سے ایک نام ہے، جس کے معنی ہیں "خوشخبری دینے والا" "بشارت دینے والا"۔ یہ لفظ حضورؐ کی صفت کے طور پر بھی آیا ہے۔ قرآن مجید ان معنوں میں بشیر ہے کہ وہ انسان کو اُخروی زندگی کی نعمتوں، آسائشوں اور جنت کی بشارت دیتا ہے، بشرطیکہ وہ اس قرآن مجید کی پیروی کرے اور وہ نیک لوگوں کو جنت کے اچھے انجام کی خوشخبری دیتا ہے۔

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا	یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں کھول کر بیان
عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ بَشِيْرًا	کر دی گئی ہیں، یعنی قرآن عربی جو سمجھ والوں کے
وَّنَذِيْرًا ج	لیے مفید ہے اور انہیں بشارت دینے والا اور
(حٰم سجدہ - ۳، ۴)	خبردار کرنے والا ہے۔

بصائر | قرآن مجید کی ایک صفت "بصائر" ہے، جو بصیرت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں سمجھ بوجھ، علم کی روشنی، کھلی حقیقت۔ قرآن مجید اس مفہوم میں "بصائر" ہے کہ وہ ایسی کھلی حقیقتوں کا بیان ہے جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔ وہ علم کی ایسی روشنی ہے کہ جس میں کسی دھوکے، فریبِ نظر، جہالت یا گمراہی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ دل کی آنکھوں کے پردے ہٹا دینے والی کتاب ہے۔

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ	یہ (قرآن) لوگوں کے لیے بصیرتوں کا مجموعہ

وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ٥

ہے اور ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اور یقین رکھنے والوں کے لیے بڑی رحمت ہے۔

(الجاثیہ-۲۰)

بلاغ | قرآن مجید کا ایک نام "بلاغ" بھی ہے جس کے معنی ہیں "پیغام" یا "وہ ذریعہ جو منزلِ مقصود تک پہنچا دے"۔ قرآن مجید کو بلاغ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بندوں کے نام پیغام ہے۔ اور یہ قربِ الٰہی کا ذریعہ بھی ہے۔

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوْٓا اَنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ٥

یہ (قرآن)، لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے اور تاکہ اس کے ذریعے سے وہ خبردار کر دیے جائیں اور تاکہ وہ یقین کر لیں کہ وہی ایک معبود ہے اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں۔

(ابراھیم-۵۲)

بیان | قرآن مجید کا ایک صفاتی نام "بیان" بھی ہے، جس کے معنی ہیں "اظہارِ حقیقت"، "کسی چیز کا کھل کر سامنے آنا"، "واضح ہو جانا" اور "وہ دلیل جس سے کوئی چیز ظاہر ہو جائے"۔ قرآن مجید ان معنوں میں بیان ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے انسان، کائنات اور خدا کے بارے میں اصل حقیقت کا اظہار ہے۔ وہ راہِ ہدایت کو واضح کرتا ہے اور زندگی کی غلط راہوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ٥

یہ لوگوں کے لیے ایک بیان ہے اور ڈرنے والوں کے لیے ہدایت اور نصیحت ہے۔

(آلِ عمران-۱۳۸)

بیّنہ | قرآن مجید کی ایک صفت "بیّنہ" ہے۔ جس کے معنی ایسی واضح حقیقت اور روشن دلیل کے ہیں جو عقلی اعتبار سے اور محسوس طور پر واضح ہو۔ قرآن مجید کے "بیّنہ" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک ایسی کھلی حقیقت اور روشن دلیل ہے جو عقل کو اپیل کرتی ہے اور جسے انسانی بصیرت محسوس کرتی ہے۔

فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ

پس اب آچکی ہے تمہارے پاس تمہارے

رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ ۚ (الانعام - ۱۵۷) — رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت۔

تبیان | قرآن مجید کا ایک نام "تبیان" ہے، جس کے معنی ہیں "واضح اور مفصل طور پر بیان کرنا"۔ قرآن مجید کے "تبیان" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ہر اس چیز کو واضح اور مفصل طور پر بیان کر دیا ہے، جس کا تعلق عقیدے اور عمل سے ہے۔ گویا قرآن مجید وہ کتاب ہے جس میں دینِ اسلام کی پوری وضاحت موجود ہے اور شہادتِ حق ادا کر دی گئی ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ۝ (النحل - ۸۹) — اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے ہر بات کو کھول دینے والی اور اہلِ اسلام کے حق میں ہدایت اور رحمت اور خوشخبری ہے۔

تذکرہ | قرآن مجید کا ایک صفاتی نام "تذکرہ" ہے، جس کے معنی ہیں "یاد دلانا"، "یاد دہانی کرانا"۔ قرآن مجید ان معنوں میں تذکرہ ہے کہ یہ ہمیں ہماری اصل فطرتِ اسلام یعنی توحید کے سبق کی یاد دہانی کراتا ہے۔ وہ ہمارے ضمیر کو خوابِ غفلت سے جگاتا اور جھنجوڑتا ہے۔ وہ ہمیں تاریخی واقعات اور پہلی قوموں کے حالات کی یاد دہانی کراتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور بے لاگ انصاف کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔

وَإِنَّهُ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ (الحاقہ: ۴۸) — اور یہ (قرآن) بے شک نصیحت ہے متقیوں کے لیے۔

تنزیل | قرآن مجید کا ایک نام "تنزیل" بھی ہے، جس کے معنی ہیں "نازل کرنا"، "نازل شدہ"، "اُتارا ہوا"۔ قرآن مجید کو اس لیے تنزیل کہا گیا ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے۔ کسی انسان یا مخلوق کا قول نہیں ہے۔ اور اسے اللہ تعالیٰ نے نہایت اہتمام سے نازل فرمایا ہے۔

وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ (الشعراء: ۱۹۲) — اور بے شک یہ (قرآن) پروردگارِ عالم کا اُتارا ہوا ہے۔

حق | قرآن مجید کی ایک صفت "حق" بھی ہے۔ حق کے معنی ہیں۔ ایسی بات جو ثابت ہو، اٹل ہو،

آمیٹ ہو، اور قائم و باقی رہنے والی ہو۔ قرآن ان معنوں میں "حق" ہے کہ اس کی ہر بات اٹل ہے، ثابت ہے اور حقائق و واقعات کے مطابق ہے۔ اس کی ہر دلیل سچی اور ہر دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے۔ زمان و مکان کے تغیر سے اس کی بات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہو سکتا۔ یہ اپنے مقابلے میں آنے والی ہر چیز کے سامنے قائم و ثابت ہے اور کوئی چیز اس کے مقابلے میں آ کر ٹھہر نہیں سکتی۔ اس میں ثبات اور قیام ہے، فرار اور زوال نہیں۔

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَ اٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝	اصل یہ ہے کہ میں نے ان لوگوں کو اور ان کے باپ دادوں کو خوب سامان دیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس حق اور ایک روشن رسول آ گیا۔ اور جب ان کے پاس حق آ گیا تو وہ بولے کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کے منکر ہیں۔

(الزخرف ۲۸، ۲۹)

حکم | قرآن مجید کا ایک نام "حکم" بھی ہے۔ جس کے معنی ہیں "فیصلہ"، "ماخذِ قانون" اور "ضابطۂ حیات"۔ قرآن مجید ان معنوں میں "حکم" ہے کہ یہ انسانی زندگی کے لیے مکمل ضابطہ ہے۔ ہر قسم کے معاملات کے لیے ماخذِ قانون اور بہترین فیصلہ ہے اور اس میں حیاتِ انسانی کے لیے اوامر و نواہی کے ضابطے موجود ہیں۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ط (الرعد۔ ۳۷)	اور اسی طرح ہم نے اس (کتاب) کو نازل کیا ہے بطور ایک صاف حکم کے۔

حکمت | قرآن مجید کی ایک صفت "حکمت" بھی ہے۔ جس کے معنی ہیں "دانائی"، محکم اور دانشمندانہ بات فیصلے میں عدل و انصاف کو ملحوظ رکھنا اور جہالت، گمراہی اور افراط و تفریط سے بچ کر چلنا۔ قرآن مجید اس لحاظ سے حکمت ہے کہ اس میں دانائی ہی کی باتیں مذکور ہوئی ہیں۔ اس میں جہالت و نادانی کا گذر نہیں کیونکہ یہ ایک حکیم و دانا ہستی کا کلام ہے۔ اس کی ہر بات محکم ہے اور دانش پر مبنی ہے۔ اور عدل و انصاف کے تمام تر تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر کہی گئی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۙ	اور ان لوگوں کے پاس اتنی خبریں پہنچ چکی ہیں کہ جن میں کافی عبرت ہے۔ اعلیٰ درجے

حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ہ (القمر ۵) — کی دانشمندی ہے، مگر خبردار کرنے والی چیزیں انہیں کچھ فائدہ نہیں دیتیں۔

حکیم | قرآن مجید کا ایک نام "حکیم" بھی ہے، جس کے معنی ہیں "دانا" "عقل و دانش سے بھرپور، حکمت بھرا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے بھی ہے۔ قرآن مجید اس اعتبار سے "حکیم" ہے کہ اس کے ہر بیان میں حکمت، دانائی اور بصیرت ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو بلا مقصد ہو، فضول یا بے کار ہو، اس کے ہر حکم میں حکمت و مقصد اور اس کی ہر بات میں دانش و دانائی موجود ہے۔

يٰسٓ ہ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ہ — یا سین۔ قسم ہے قرآن حکیم کی۔

(یٰسٓ ۱-۲)

ذکر | قرآن مجید کا ایک صفاتی نام "ذکر" ہے۔ جس کے معنی نصیحت، یاد دہانی اور شرف و عزت کے ہیں۔ قرآن مجید کو ذکر اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے ایک نصیحت نامہ ہے۔ وہ ایک ایسی یاد دہانی ہے جس سے انسان کا خوابیدہ ضمیر اور اس کی خفتہ فطرت کو جگایا جا سکتا ہے تاکہ وہ اپنے خالق کی صحیح معرفت حاصل کر سکے اور راہ ہدایت پہ گامزن ہو سکے۔ نیز وہ سابقہ اقوام کے عروج و زوال کو بیان کر کے انسان کی توجہ قوانینِ الٰہی اور نوامیسِ فطرت کی طرف مبذول کراتا ہے۔ مزید برآں قرآن مجید اس لحاظ سے بھی ذکر ہے کہ اس پہ عمل کر کے قومیں عزت و شرف حاصل کر سکتی ہیں۔ اور اس کو ترک کر کے وہ قعرِ ذلت میں گر سکتی ہیں۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ہ (الحجر۔ ۹) — بیشک ہم نے اس ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

(باقی)

قرآن مجید کے ہندی تراجم

جناب مولانا محمد فاروق خان

قرآن مجید کے ہندی ترجمے کی کوشش کوئی نئی کوشش نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۲۷۰ھ میں مہروک بن رائک ایک حکمران ہوا ہے۔ اس کے حدودِ سلطنت میں کشمیر سے لے کر پنجاب اور راجستھان تک کے علاقے شامل تھے۔ یہ وہ دور ہے جب سندھ پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ راجہ کی خواہش پر سندھ کے حاکم عبداللہ بن عمر نے ایک ایسے عالم کو بھیجا جو ہندوستان کی زبانوں سے واقف تھا۔ وہ راجہ کے یہاں تین سال تک رہا۔ راجہ کی فرمائش پر اس نے قرآن مجید کا ترجمہ کرنا شروع کیا اور سورۂ یٰسٓ تک ترجمہ مکمل کر لیا۔ اس کا ذکر چوتھی صدی ہجری کے مشہور و معروف سیاح ابن شہریار نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔[۱]

قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ مغل بادشاہ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ یہ ترجمہ مکمل ہے۔ اس ترجمے کی بعض خصوصیات کا ذکر ہم آگے کریں گے۔ اس ترجمے کو دیکھنے کا شرف مجھے خود حاصل ہوا ہے۔[۲] مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی نے غالباً اسی ترجمہ کا ذکر مولانا سید محمد علی سے فرمایا تھا۔ مولانا سید محمد علی نے لکھا ہے کہ ایک روز عصر کے وقت مجھے بلا کر ارشاد فرمایا:

"مولوی عبدالقادر صاحب کے ترجمے سے دو سو برس پیشتر بھاکا (ہندی) میں

۱۔ بزرگ ابن شہریار، کتاب عجائب الہند، تہران، ۱۹۶۶ء، ص ۳، ۴۔

۲۔ عرصہ ہوا یہ نسخہ مجھے ایک ایسے شخص نے دکھایا تھا جو پرانی اور نادر چیزوں کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتا تھا۔

نہایت عمدہ ترجمہ قرآن شریف کا ہوا ہے - ہم نے دیکھا ہے"[1]۔

مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (متوفی ۱۸۹۶ء) نے بھی قرآن کی کچھ سورتوں اور کچھ حصوں کا ترجمہ ہندی میں کیا تھا جو پہلے گلشنِ ابراہیمی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا اور بے حد پسند کیا گیا۔ دارالاشاعت کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) نے قریبی زمانے میں اس ترجمہ کو دوبارہ شائع کیا ہے - اس کا ایک نسخہ میرے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہے۔

خواجہ حسن نظامی کا قرآن پاک کا کرایا ہوا ہندی ترجمہ بھی مشہور و معروف ہے۔ یہ ترجمہ مولانا غلام محمد صاحب (سابق پنڈت کیشو رام شرما) اور کئی دوسرے ہندو اور مسلم ماہرین ہندی کی مدد سے تیار ہوا تھا۔ یہ ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا تھا - پہلی جلد ۱۹۲۸ء میں اور دوسری ۱۹۲۹ء میں شائع ہوئی -

قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ مولانا احمد بشیر فرنگی محلی اور غلام محمد قریشی نے بھی کیا تھا جو بغیر متن کے شائع ہوا تھا۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترجمہ ۱۹۴۷ء کے بعد شائع ہوا ہے۔

شیخ محمد یوسف قادیان (ضلع گورداسپور) نے بھی قرآن مجید کا ایک ہندی ترجمہ کیا تھا۔ غالباً اس کی اشاعت ۱۹۱۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان ہوئی تھی۔ پادری ڈاکٹر احمد شاہ مسیحی نے القرآن کے نام سے قرآن کا ہندی ترجمہ ۱۹۱۵ء میں راجپور، ضلع دہرہ دون سے شائع کیا تھا۔ یہ ترجمہ بغیر متن کے چھپا تھا۔ اس کے تین ایڈیشن نکلے - پہلا ایڈیشن پرتاپ پریس کان پور سے شائع ہوا تھا۔ آخری ایڈیشن ۱۹۳۵ء میں نکلا - یہ ترجمہ عربی سے براہِ راست کیا گیا ہے۔ ترجمہ کے ساتھ مختصر حواشی اور بائبل کے حوالہ جات بھی دیئے گئے ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے لئے یہ حواشی بڑے ہی کارآمد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ کو ہنری مارٹن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جبل پور نے پھر شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔

بلہور ضلع کان پور کے قاضی عابد علی صاحب (متوفی ۱۹۶۱ء) نے قرآن کا آسان ہندی زبان میں ایک ترجمہ کیا تھا جو قسط وار ماہنامہ اسلام کانپور میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے پندرہ پارے چھپے تھے۔ ۱۹۵۵ء میں جماعت اسلامی ہند نے قرآن کے پہلے پارے کا ہندی ترجمہ شائع کیا تھا جو پورے قرآن

---

[1] سید محمد علی: ارشاد رحمانی، مطبع فیض منبع شاہجہانی (بدون مقام و سنِ اشاعت) ص ۴۶۔

کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اصل ترجمہ اردو زبان میں مولانا صدرالدین اصلاحی نے کیا تھا۔ اسے ہندی میں منتقل کرنے کا فریضہ تین اشخاص نے انجام دیا۔ جس میں ایک غیر مسلم پنڈت کیلاش ناتھ برہسپت بھی شامل تھے۔

حافظ امام الدین رام نگری نے قرآن کے آخری پارے کا ہندی ترجمہ ۱۹۵۸ء میں شائع کیا تھا اس کے دو ایڈیشن نکلے۔ ایک متن کے ساتھ اور دوسرا متن کے بغیر۔

قرآن کا ایک ترجمہ ہندی میں نند کمار اوستھی نے لکھنؤ سے شائع کیا۔ انھوں نے قرآن کے متن کو بھی ہندی رسم الخط میں منتقل کر کے ترجمہ کے ساتھ رکھا۔ کچھ حواشی بھی لکھے۔

ہندی زبان کے مشہور و معروف شاعر و ادیب بھارتیندو ہرش چندر (भारतेन्दु हरीश्चन्द्र) (متوفی ۱۸۸۵ء) نے بھی قرآن کا ہندی ترجمہ کرنا شروع کیا تھا۔ یہ ترجمہ رسالہ ہرش چند چندر کا ۱۸۷۷ء کے جلد ۵، شمارہ ۱، ۲ سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ افسوس کہ یہ سلسلہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا[1]

راقم الحروف کو بھی خدا کے فضل سے قرآن کا ہندی ترجمہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ ترجمہ مدیر الحسنات، رام پور کی نگرانی میں کیا گیا تھا۔ اس ترجمہ کے سلسلہ میں مجھے بعض ہدایات کی پابندی کرنا پڑی۔ مثلاً اصطلاحی الفاظ کو ترجمہ میں جوں کا توں رکھا جائے۔ یعنی اللہ، آخرت، رسول، زکوٰۃ کے قسم کے الفاظ کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ بلکہ یہی الفاظ ترجمہ میں استعمال کئے جائیں۔ البتہ کتاب کے آخر میں ان الفاظ کی تشریح کر دی گئی ہے۔ یہ ترجمہ حواشی کے ساتھ پہلی بار جنوری ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اور اب تک اس کے نو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

اوپر قرآن مجید کے جن ہندی تراجم کا ذکر میں نے کیا ہے ان میں سے چند کو چھوڑ کر سبھی تراجم میری نظر سے گزرے ہیں۔ یہ تراجم اپنے مقصد میں کہاں تک کامیاب رہے ہیں اس پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فنِ ترجمہ اور ترجمہ کی دشواریوں اور بالخصوص قرآن کے ترجمہ کی مشکلات پر مختصراً کچھ عرض کر دوں۔

---

[1] دھرم یگ، ۱۵ فروری ۱۹۷۰ء۔

کسی کتاب کا بہترین ترجمہ وہی ہے جس میں نہ صرف یہ کہ اصل کتاب کا مضمون کسی کمی یا تبدیلی کے بغیر منتقل ہو بلکہ اس کے ساتھ اصل کتاب کی تاثیر بھی منتقل کی جاسکی ہو۔

کلام بنیادی طور پر دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا مقصد صرف کچھ باتیں یا معلومات پڑھنے یا سننے والوں تک پہنچا دینا نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ ہی اس کا مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ سامعین یا قارئین کی رُوح کو بھی بیدار کیا جائے۔ ان کے اندر سوئے ہوئے جذبات کو جگایا جائے، انھیں ان کیفیات کی شیرینی یا تلخی سے آشنا کیا جائے، جن سے بالعموم لوگ ناآشنا نظر آتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر اس کے پیش نظر کسی قوم یا پوری انسانیت کے اندر انقلاب برپا کرنا بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح کے مقاصد کے حصول کے لیے ظاہر ہے کہ سپاٹ اور سادہ بیان کافی نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے جس قسم کا کلام درکار ہوتا ہے اسے کلامِ مؤثر کہہ سکتے ہیں۔

کلام کی دوسری قسم وہ ہے جس کا مقصد صرف آپ کے لیے کچھ معلومات فراہم کرنی ہوتی ہے جیسے جغرافیہ یا فزکس کی کتاب میں آپ دیکھتے ہیں۔ اس طرح کی کتابوں کا اندازِ بیان کلامِ مؤثر سے بالکل مختلف ہوگا اور ہونا بھی چاہیے۔ جغرافیہ کی کتاب میں شاعری یا خطبے کا انداز اختیار کرنا نہایت غلط اور مضحکہ خیز بات ہوگی۔

قرآن مجید کے بارے میں اس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کا کلام مؤثر ہے۔ وہ کوئی سپاٹ اور سادہ کتاب نہیں ہے۔ اس کے کلام میں جو وقار، زور، بہاؤ، شیرینی، نغمگی، ادب اور صوتی جمال پایا جاتا ہے وہ اپنی جگہ بے مثل ہے۔

ترجمہ بھی ایک تخلیقی کام ہے۔ ترجمہ اور تخلیق میں فرق کرنا صحیح نہیں۔ کامیاب ترجمہ وہی ہے جسے پڑھ کر محسوس نہ ہو کہ وہ ترجمہ ہے۔ نیز ہر زبان کا اپنا ایک مزاج اور لہجہ ہوتا ہے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ مثال کے طور پر IT IS GOING TO کا ترجمہ "یہ ہونے جا رہا ہے" ترجمہ کی زبان کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ صحیح ترجمہ یہ ہوگا: "یہ ہونے والا ہے"۔

ترجمہ میں ترجمہ کرنے والے کے جذبِ اندرون کی شمولیت ضروری ہے، کیونکہ اس کے بغیر اس کام میں اصلیت وصداقت کا وصف پیدا نہیں ہوسکتا۔ ترجمہ محض نقل نہیں ہے۔ ترجمہ میں اصل کے سارے ہی امکانات کو کم و بیش سمیٹنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ یہ فریضہ کیوں کر ادا ہو؟ اس سے

لیے ضروری ہے کہ ترجمہ کرتے وقت اصل کا مفہوم و مدعا ہی نہیں، بلکہ اس کی تیزی و تیکھاپن، اس کی نرمی و لطافت اور اس کی دلکشی و جاذبیت وغیرہ بھی پیشِ نظر ہو۔ اس میں جو زور، نرمی، دلکشی و سادگی پائی جاتی ہو اُسے بھی ترجمے میں اُتارنے کی کوشش کی جائے۔ ترجمے کا کام صرف ڈکشنری سے نہیں چل سکتا۔ ممکن ہے کہ ڈکشنری میں کسی لفظ کے دیئے ہوئے معنی سے کچھ اور وسیع مفہوم میں اس کا استعمال کیا گیا ہو۔ مثلاً کسی نے لکھا ہے: یہ آئین چھوٹی بڑی قوموں کے EQUILIBRIUM پر قائم ہے۔ مصنف نے یہاں ایک خاص لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظ کا انتخاب بے معنی نہیں ہے۔ لغت میں اس کے معنی دیئے ہیں STATE OF BEING PERFECTLY BALANCED لیکن صاف ظاہر ہے کہ توازن اور غیر جانب داری (NEUTRALITY) کے ساتھ اس میں کوئی اور بات بھی شامل ہے۔ اب اگر ترجمہ میں یہی توازن یا غیر جانب دارانہ حالت وغیرہ رکھ دیا جائے تو مصنف کا منشا ظاہر نہ ہو سکے گا۔ اس کی جگہ اگر آپ "ہم آہنگی" یا "جذب باہم" رکھتے ہیں تب کہیں جا کر مصنف کے اصل مدعا کا اظہار ہو سکے گا۔

بعض اوقات اصل عبارت یا لفظ کے کئی معانی نکل رہے ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں سوچنا ہوگا کہ کیا اس میں کئی معنی پیدا کرنا مصنف کا منشا ہے؟ یعنی کیا اُسے ایک رنگ میں کئی ہلکے ہلکے رنگوں کی آمیزش مطلوب ہے؟ یا اس کے ذہن میں محض ایک ہی مفہوم ہے۔ لیکن اس نے لفظ یا جملہ ایسا لکھ دیا ہے کہ جس سے کئی معنی کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ترجمہ میں پیروی مصنف کے منشا ہی کی کرنی ہوگی۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لفظ اپنے اصل معنی سے دُور ہو کر ثانوی معنی میں استعمال ہونے لگتا ہے۔ اب اگر کوئی اصل معنی ہی کو ترجمہ میں رکھتا ہے تو یہ غلط ہوگا۔ کسی تقریر یا تحریر کا اصل مقصد خیالات کا ابلاغ ہے، لیکن اگر محض الفاظ کو دوسری زبان میں منتقل کر دینے سے مفہوم پوری طرح ادا نہیں ہوتا یا اس قوت یا اثر کے ساتھ منتقل نہیں ہوتا جس قوت اور اثر کے ساتھ اصل تحریر یا تقریر میں اس مفہوم و خیال کا اظہار ہوا ہے تو ایسی حالت میں الفاظ اور ان کی تقدیم و تاخیر اور جملوں کی ساخت وغیرہ میں تبدیلی لاکر یہ مقصد پورا کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر ترجمہ کا اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصل عبارت میں جملے کی کوئی ساخت فصیح ہو، لیکن ترجمہ کی زبان میں اسے اختیار کرنے سے فصاحت ختم ہو جاتی ہو۔ ایسی صورت میں اس سے پرہیز ضروری ہے۔

ترجمے کے وقت اصل عبارت کے علاوہ اس کے بین السطور (BETWEEN THE LINES)

کو بھی پڑھنا چاہیے اور بین السطور (جو مفہوم ان الفاظ کے درمیان پوشیدہ ہوتا ہے۔ الفاظ میں ظاہر نہیں کیا گیا ہوتا) کی مدد سے اصل عبارت کا ترجمہ کرنا چاہیئے۔ ترجمہ میں جہاں تک ممکن ہو مصنف کا رنگ اور اس کا طرز اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اصل مصنف کے رنگ کو ترک کر کے اگر مترجم اپنا رنگ اختیار کرتا ہے تو ترجمے میں مصنف کے بجائے مترجم چھا جائے گا اور یہ ایک بہت بڑا عیب و نقص قرار پائے گا۔ ترجمے تین قسم کے ممکن ہیں۔ ایک لفظی ترجمہ، دوسرا آزاد ترجمہ جس میں اصل مصنف کے صرف خیالات کی پیروی الفاظ سے بے نیاز ہو کر کی جاتی ہے۔ اور تیسرا ان دونوں کے درمیان۔ یہی تیسری قسم سب سے بہتر ہے۔ اسے تخلیقی (CREATIVE) ترجمہ کہہ سکتے ہیں۔ خیال اور مفہوم اپنے باریک سے باریک پیچ و خم کے ساتھ ادا ہو ترجمہ کا کمال یہی ہے۔ اس کے لیے مترجم کو اصل مصنف کی شخصیت میں اپنے کو گم کرنا پڑتا ہے۔ ترجمہ کرنے والا یہ ملحوظ رکھے کہ فلاں بات یا عبارت کو اگر ترجمہ کی زبان میں لکھنا ہوتا تو مصنف کس طرح لکھتا بس اسی کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اس جہت سے اگر ترجمہ کامیاب ہے تو اسے کامیاب کہا جائے گا۔ اس کی ایک مثال یہ دی جاتی ہے۔ انگریزی کا ایک فقرہ ہے:-

I AM THE GOD WHO WAS BORN OF THE MIND OF THE CREATOR.

اس کا کامیاب ترجمہ یہ ہے: "میں وہ دیوتا ہوں جو کرتار کے من میں پیدا ہوا"۔

MIND کا ترجمہ ذہن، دماغ، دل بھی کیا جا سکتا تھا لیکن من ہی اس کا صحیح اور بہتر ترجمہ ہو سکتا تھا۔ اہل ذوق اس بات کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی طرح (CREATOR) کا ترجمہ کرتار ہی موزوں تھا۔ مفہوم اور اثر کے لحاظ سے بھی اور صوتی اعتبار سے بھی۔

شاعری کے ترجمے کے بارے میں یہ بات مشہور و معروف ہے کہ اس کا ترجمہ کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ شاعری کے ترجمے میں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ اس کو پابند نظم میں منتقل کیا جائے یا اسے آزاد نظم کے قالب میں ڈھالا جائے۔ اس کے لیے دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔ بحروں کے انتخاب کا مسئلہ کم اہم نہیں ہے۔ مختلف بحور کی مختلف تاثیر ہوتی ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ شاعری کے ترجمے میں یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ اس کے ترجمے میں اصل متن سے وفاداری یعنی اس کی پیروی کس حد تک ضروری ہے۔ ترجمے میں تازگی نیز تخلیقی اثر باقی رکھنے کے لیے اصل متن کی پیروی بس ایک حد تک ضروری ہے ورنہ

یہ تو کوئی تخلیقی کارنامہ ثابت نہیں ہو سکتا اور نہ اس میں اصل کی تاثیر ہی باقی رہ سکتی ہے۔ کسی نظم کا ترجمہ دراصل قوت اور تخیلی صلاحیت صرف کر کے اسے از سرِ نو جنم دینا ہوتا ہے۔

قرآن مجید جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کوئی سپاٹ کلام نہیں ہے۔ کسی عظیم شاعری سے کہیں بڑھ کر اس کے اندر زور و تاثیر اور نغمگی اور صوتی جمال پایا جاتا ہے لیکن بالعموم قرآن کے جو ترجمے ہوئے ہیں ان میں ان خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت نہیں ملتی۔ ترجمے اکثر لفظی کیے گئے ہیں جس کی وجہ سے ترجمہ کی عبارت پھیکی ہو کر رہ گئی ہے۔ معاملہ چونکہ کلامِ الٰہی کا تھا اس لیے مترجمین ترجمے میں کسی آزادی کے روادار نہیں ہوسکے[1]۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی یا اردو زبان میں جس حد تک زور و تاثر لانا ممکن بھی تھا اس سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔

جہاں تک اسٹائل، اسلوب اور ادبی محاسن کا تعلق ہے اس سلسلے میں قرآن کا ترجمہ کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری تھا کہ قرآن کے ترجمے کی زبان عام زبان سے ممتاز ہو۔ خود قرآن کی زبان اپنے زمانۂ نزول کی عربی سے ممتاز اور مختلف ہے۔ قرآن نثر اور نظم دونوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔ نثرِ مقفیٰ میں ہم جانتے ہیں کہ اگر نثر کی ترتیب (PROSE ORDER) نہ بھی ہو تو کوئی حرج نہیں کیونکہ عبارت کا حُسن اور اس کی دلکشی اس بے ترتیبی کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ لیکن ترجمہ اگر سادہ ہے تو پھر نثر میں بے ترتیبی اور انتشار ناگوار ثابت ہوگا۔

اس کے علاوہ ہم اشارہ کر چکے ہیں مصنف کا رنگ و آہنگ اور اظہارِ جذبات کلام کی جان ہے۔ اس کا لحاظ ضروری ہے۔ مثال کے طور پر کسی شاہانہ کلام کو اگر سوقیانہ (بازاری) زبان میں منتقل کر دیا جائے تو یہ اس کا خون کرنا ہوگا۔ (باقی)

---

[1] یہ بھی تو ایک طرح کی آزادی ہے کہ الفاظ کی صفیں تو کھڑی کر دی جائیں مگر بیان اور ابلاغ کی جو خوبیاں مصنف کو مطلوب تھیں، غائب کر دی جائیں۔ (ز ۔ ص)

اسلامی قانون جامد کیوں؟

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

سوال: اسلام کا قانون جامد کیوں ہے؟ انسانوں کو قانون دینے کی اللہ تعالیٰ کو کیا ضرورت پیش آئی؟ یہ انسانوں کا اپنا معاملہ ہے، جیسے چاہیں وہ قانون بنائیں۔

یہ بات تو دنیا کے تمام قانون دانوں اور دانشوروں کے نزدیک مسلّم ہے کہ قانون نافذ کرنے والے جج اور قاضی کو دیانت دار اور انتہائی غیر جانب دار ہونا چاہیے۔ اس بات میں کسی بھی معقول شخص کو اختلاف نہیں ہے۔ اب اگر قانون کے نفاذ کے لیے دیانت داری اور غیر جانب داری اس قدر ضروری ہے تو پھر قانون سازی کے لیے دیانت داری اور غیر جانب داری بدرجہا ضروری ہونی چاہیے۔ ہر کس و ناکس سے، افراد اور گروہوں سے کیسے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ قانون سازی میں دیانت داری اور امانت داری اور غیر جانب داری کے تقاضے پوری طرح ملحوظ رکھیں گے۔ کون انسان ہے جو شخصی پسند و ناپسند اور طبقاتی، گروہی اور علاقائی عصبیتوں سے بالاتر ہو۔ آج کے دور میں اسمبلیاں قانون سازی کرتی ہیں۔ اسمبلیوں میں کسی ایک سیاسی پارٹی کی اکثریت ہوتی ہے۔ قانون دراصل وہ بناتی ہے۔ کیا سیاسی پارٹی عصبیت سے بالاتر ہوتی ہے۔ بلکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ وہ پارٹی کے مقاصد پورے کرنے کے لیے قانون سازی کرتی ہے۔ اس کے لیے قانون سازی بھی حصولِ مقاصد میں ایک زینہ کا کام دیتی ہے۔ کیا یہ قانون دیانت داری اور امانت داری کے تقاضے پورے کرتا ہے؟

پھر انفرادی اور گروہی عصبیتوں سے بڑھ کر زمانی اور مکانی عصبیتیں بھی ہوتی ہیں۔ سارا خطہ ایک

خاص قسم کی عصبیت میں مبتلا ہوتا ہے، سارا دور ایک خاص قسم کی عصبیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ عصبیت ہمہ گیر نوعیت کی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے۔ یورپ کے معاشرہ میں صدیوں تک عورتوں اور مردوں کے لیے مجرد رہنا، ازدواجی تعلق سے ناآشنا رہنا اعلیٰ ترین کردار سمجھا جاتا رہا۔ کوئی فرد اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتا تھا۔ آج متفقہ طور پر سب لوگ اس طرزِ عمل کو غلط اور برا سمجھتے ہیں۔ اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس پورے دور کی عقلِ اجتماعی غلط کار تھی، حق سے ناآشنا تھی۔ ہندوستان میں صدیوں تک شوہر کی موت پر بیوی کو لاش کے ساتھ جل مرنا پڑتا تھا یعنی ستی ہونا پڑتا تھا۔ کسی کو اس میں کوئی عیب نظر نہیں آتا تھا۔ عورت پر کتنا صریح ظلم تھا۔ آج سارا ہندوستان اس فعل کو غلط قرار دیتا ہے۔ گویا صدیوں تک عقلِ انسانی غلط کاری میں سرگرداں رہی۔ مختلف قسم کی عصبیتیں عقلِ انسانی کی کارکردگی کو مجروح اور ناقص بناتی رہتی ہیں۔ انسان جب اپنی اس عقل کے ساتھ قانون سازی کرتا ہے تو نہ دیانت دار رہ سکتا ہے نہ امانت دار رہ سکتا ہے اور نہ غیر جانب دار۔ کسی بھی ملک کی قانون سازی کی تاریخ پڑھ لیجیے، آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسانی عقل کس کس طرح قلابازیاں کھاتی رہی ہے۔

مغربی ممالک کی فکری فضا میں سکۂ رائج الوقت ڈارونیت ہے جس میں ساری اہمیت بقائے اصلح (SURVIVAL OF THE FITTEST) کو حاصل ہے۔ جس میں طاقتور کو حق حاصل ہے کہ وہ کمزوروں کو دبائے، کچلے اور پیسے۔ انسانیت، شرافت اور اخلاق کا وہاں گزر نہیں۔ اسی نظریے سے تقویت پاکر یورپ اور امریکہ نے ساری دنیا کو دبا رکھا ہے اور کچل رکھا ہے۔ اقوامِ متحدہ عدل و انصاف کا عالمی ادارہ ہے، وہاں جس طرح قانون سازی کی جاتی ہے اور پھر جس طرح اس کو نافذ کیا جاتا ہے، وہ ظاہر و باہر ہے۔ وہاں چھ مقتدر ریاستیں ویٹو کے قانون کی حامل ہیں۔ ان کے خلاف دادرسی کا کوئی امکان نہیں۔ وہ گویا گناہ سے پاک اور غلطی سے مبرا ہیں۔ دوسرے درجے پر اینگلو سیکسن اقوام کا دائرہ ہے۔ ان کا مرتبہ بھی بلند و بالا ہے۔ ان کے حقوق بھی وہاں محفوظ ہیں۔ پھر ایشیا اور افریقہ کی رنگدار اقوام ہیں۔ ان کو دبایا، کچلا اور پیسا جا سکتا ہے اور عملاً یہی کچھ ہو رہا ہے۔ سیاسی طور پر وہ سفید فام اقوام کے خصوصاً دو بڑی طاقتوں کے آگے دست نگر ہیں اور معاشی طور پر بھی ان کے آگے دست نگر ہیں۔ یہ ہے انسانوں کے عالمی ادارہ کی قانون سازی اور قانون کی تعمیل۔ کیا وہاں انصاف ہے، عدل ہے؟

کیا وہاں مساوات ہے؟ کیا دیانت ہے؟ امانت ہے؟ کیا جانب داری نہیں ہے؟
ڈارونیت کی قائل مغربی اقوام کو اس ظلم و ستم پر کوئی تشویش نہیں۔ ان کے نزدیک قانونِ فطرت یہی ہے۔ انہیں اس چوٹ کی کسک محسوس نہیں ہوتی جو کمزور افراد اور کمزور اقوام ان کے ہاتھوں سہتی رہتی ہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی کا ان کے یہاں یقین نہیں۔ آخرت میں اعمال کی جوابدہی پر ان کا ایمان نہیں۔ تنازع للبقا کے قانون پر ان کا عمل ہے۔ اس سے آگے ان کی پرواز نہیں۔
زندگی کا تصور ایک مسلمان کے نزدیک ہرگز یہ نہیں ہے۔ یہ دنیا اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے پیدا کی ہے۔ دنیا کی نعمتوں پر سب کا حق ہے۔ سارے انسان آزاد ہیں۔ علم، ارادہ، اختیار، تصرف کی قوتوں سے بہرہ ور ہیں۔ یہ نعمتیں اس لیے دی گئی ہیں کہ وہ بہتر سے بہتر اعمال کا مظاہرہ کریں۔ سارے انسان دنیا کی زندگی میں درحقیقت ایک امتحان سے گزر رہے ہیں۔ یہ نعمتیں اسباب و وسائل ہیں امتحان کے تاکہ وہ امتحان کا پرچہ (نامۂ اعمال) بہتر سے بہتر طور پر حل کریں۔ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں اس کا نتیجہ برآمد ہوگا۔ پھر یا ترقی (PROMOTION) یا تنزل (DEMOTION)
اس حقیقت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ یہ بات کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ چند چالاک اور شاطر افراد انسانوں کو اپنا محکوم اور غلام بنا لیں۔ امتحان دینے میں مانع آئیں۔ امتحان میں خلل ڈالیں۔ لوگوں کو دبائیں کچلیں اور پیسیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے قانون سازی کا حق اصولی طور پر انسانوں کو نہیں دیا۔ بلکہ اپنے پاس رکھا ہے اور اس لیے نہیں دیا کہ انسان من مانی کر کے دوسرے انسانوں کو دباتے ہیں، کچلتے ہیں اور پیستے ہیں۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ٥	خبردار رہو، اسی کی خلق ہے اور اسی کا حکم ہے۔ اللہ بڑا بابرکت ہے۔ سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔
(الاعراف - ۵۴)	

اس آیت میں کئی باتیں قابلِ توجہ ہیں، غور کرنے کے قابل ہیں:
۱۔ جس ہستی نے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے، جس کی نظر تمام انسانوں کی احتیاجوں، تقاضوں اور مطالبوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اُسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ انسانوں کے لیے قانون بنائے،

وہ حکم نافذ کرے۔ وہ سارے انسانوں کے فائدے کے لیے ہوگا۔ تنگ نظر، تنگ دل انسان اس منصب عظیم کا اہل نہیں ہے۔

۲۔۔۔ وہ ہستی تمام انسانوں کی ساری صلاحیتوں کو پروان چڑھانا چاہتی ہے۔ وہ اعمال و کردار، تہذیب و اخلاق، تمدن و معاشرت ہر پہلو سے انسانوں کو ترقی دینا چاہتی ہے۔ وہ انسانوں کو برکت دینا چاہتی ہے۔ اس لیے قانون سازی کی وہ زیادہ اہل ہے۔ نہ کہ تنگ دل، تنگ نظر، خود غرض انسان۔

۳۔۔۔ وہ ہستی تمام انسانوں کی پرورش کرنے والی ہے۔ وہ انسانی مفادات ۔۔۔ انفرادی، اجتماعی اور نوعی ۔۔۔ کو بہتر طریق پر سمجھتی ہے اور پورا کرتی ہے اس لیے قانون سازی کی وہ زیادہ اہل ہے، نہ کہ تنگ نظر، تنگ دل اور خود غرض انسان۔

یہاں تک اصولی بحث ہو رہی تھی کہ قانون سازی کا اہل انسان نہیں ہو سکتا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا دائرہ کار ہے۔ آگے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ قانون سازی کس طرح کی ہے۔ اسلامی شریعت، اسلامی قانون دو اجزا پر مشتمل ہے۔ ایک حصہ دائمی ہے، مستقل ہے (R I G I D) اور دوسرا تغیر پذیر ہے (F L E X I B L E)۔ قانون کا دائمی اور مستقل حصہ ۔۔۔ جس کو معترض نے جامد کا نام دیا ہے ۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے دو وجہ سے دیا ہے۔

آج کی دنیا میں تغیر اور تبدل کا بڑا غلغلہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر شے متغیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مغربی انسان چاند پر جا پہنچا اور ہم ابھی تک زمین پہ ہی پڑے ہیں۔ بلاشک و شبہ انسانی معاشرہ میں تغیرات آتے ہیں۔ تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ کوئی شخص اس کا انکار نہیں کرتا۔ مگر کوئی مرد فہیم اس بات پر بھی تو غور کرے کہ تغیرات کن پہلوؤں میں آتے ہیں اور کس درجہ میں آتے ہیں۔ کیا سارا انسانی وجود تبدیل ہو گیا؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ انسان کی جسمانی ساخت بدستور وہی ہے۔ آنکھ، ناک، کان، دل، دماغ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ آج سے ہزاروں سال پہلے جو جسمانی ساخت تھی وہی آج بھی موجود ہے۔ کیا جسم کے مطالبات میں تغیر آ گیا؟ ایسا بھی نہیں ہے۔ کھانے، آرام کرنے، جنسی خواہش رکھنے کی جبلتیں (I N S T I N C T S) وہی ہیں، جو قدیم انسان میں تھیں۔ کیا جذبات و عواطف میں تبدیلی آ گئی ہے؟ ایسا بھی نہیں ہے۔ ایثار و ہمدردی، پیار و محبت، نفرت و حقارت، بغض و کینہ،

عداوت کے جذبات اور باطنی کیفیات بھی وہی ہیں، جو قدیم انسان میں تھیں۔ حسنِ اخلاق، حسنِ اعمال، اور حسنِ کردار کے معیارات بھی وہی ہیں جو قدیم انسان میں تھے۔ پہلے بھی بعض افعال مذموم اور جرائم شمار کیے جاتے تھے۔ آج بھی اُن کو مذموم اور جرائم سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان وہی ہے جو قدیم زمانہ میں تھا۔

تغیر جو کچھ آیا ہے وہ انسان کی ذات میں نہیں آیا ہے، انسان کی فطرت میں نہیں آیا ہے، بلکہ انسان کے تمدن میں آیا ہے۔ انسان کے داخل میں نہیں آیا ہے، انسان کے خارج میں آیا ہے۔ آدم کے بیٹے پتھروں سے یا ڈنڈوں سے لڑے ہوں گے، آج ہم بموں اور میزائلوں سے لڑتے ہیں۔ آدم کے بیٹوں نے پتوں سے ستر ڈھانکا ہوگا، ہم نفیس کپڑے پہنتے ہیں۔ آدم کے بیٹے غاروں میں یا درخت کے نیچے آرام کرتے ہوں گے، ہم کوٹھیوں یا بنگلوں میں رہتے ہیں۔ ظاہر میں تغیرات آئے ہیں، بہت زیادہ تغیرات آئے ہیں، لیکن باطن میں وہی قدیم انسان موجود ہے۔ اس میں کوئی تغیر نہیں آیا۔

قانون سازی انسان کے لیے ہوتی ہے، اس کی ذات کے لیے ہوتی ہے، اس کے باطن کے لیے ہوتی ہے۔ جب ذات دائمی ہے، مستقل ہے تو پھر قانون کیوں نہ دائمی ہو اور مستقل ہو۔ اس لیے انسان کی فطرت سے واقف اللہ تعالیٰ نے جو قانون دیا ہے وہ دائمی کیوں نہ ہو۔ وہ ہر زمان و مکان کے انسان کے لیے کیوں نہ ہو۔ اس لیے قانونِ خداوندی، شریعتِ اسلامی کو دائمی اور ابدی ہونے میں کون سی شے مانع ہے۔ یہ فطرتِ انسانی کا عین تقاضا ہے کہ قانون دائمی ہو۔

عقلِ انسانی ــــ انفرادی سطح ہو یا اجتماعی سطح ــــ تلون مزاجی، عصبیت اور اغراض پرستی اور ہوا کی نارسائی کے حصار سے باہر نہیں نکل سکتی۔ اس کی نظر ہمیشہ وقتی اور ہنگامی مسائل کو ہی دیکھ سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقوامِ عالم کی قانون سازی ہر دم متغیر رہتی ہے۔ جب تک فرد کی احتیاجات، تقاضے اور اُمنگیں، انسانی معاشرہ کے تقاضے اور مطالبات اور نوع کی طلب، منتہائے مقصود پیشِ نظر نہ ہو انسان کے لیے ایک گروہ اور ایک خطہ کے لیے بھی قانون سازی نہیں کی جا سکتی۔ کسی انسانی عقل و فہم کا دائرہ اتنا وسیع نہیں ہو سکتا کہ وہ انفرادی، اجتماعی اور نوعی مطالبات کا حال اور استقبال میں تصور بھی قائم کر سکے، احاطہ کرنا تو بڑی بات ہے۔ اس لیے قانون سازی انسان کے دائرۂ فہم سے

ہی باہر ہے۔

دنیا میں انسان کی زندگی صلاحیتوں اور استعدادوں کی آزمائش کی زندگی ہے۔ انسان کو آزادی دی گئی ہے۔ علم، عقل، ارادہ واختیار کی آزادی بخشی گئی ہے۔ تمام مخلوقات — جمادات، نباتات، حیوانات — کے مقابلہ میں انسان آزاد ہے۔ جو چاہے کرے، جو چاہے کرے جو چاہے نہ کرے۔ اسی آزادی میں اس کی آزمائش ہے کہ وہ راست روی اختیار کرتا ہے یا بدراہی اختیار کرتا ہے۔ ایک ایک لمحہ جو انسان کا دنیا میں گزر رہا ہے اس میں اس کا امتحان ہو رہا ہے۔ اس کا ریکارڈ تیار کیا جارہا ہے۔ وڈیو فلم تیار ہو رہی ہے۔ اس امتحان کے لیے انسان کے لیے پُرامن ماحول اور سازگار معاشرہ درکار ہے تاکہ سب انسان حسب حیثیت امتحان دیں۔ کوئی شخص خلل انداز نہ ہو۔ اپنا نامۂ اعمال بہتر سے بہتر بنائیں۔

انسانی معاشرہ میں امن اور سازگاری پیدا کرنے کے لیے کون سے اُمور ضروری اور لازمی ہیں۔ یہ انسان اپنی تلوّن مزاجی کے تحت معلوم نہیں کرسکتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون سازی اپنی جانب سے کر دی ہے۔ ان کو حدود اللہ اور نص صریح کہتے ہیں۔ حدود اللہ کا لفظ صاف بتا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسان ایک دائرہ میں اپنے اختیارات استعمال کرے اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی نہ کرے۔ دوسروں کو بھی زندگی گزارنے کا حق دینا چاہیے۔

خلافت کے امتحان میں بیٹھنے والے ہر فرد کو ذات کا تحفظ حاصل ہونا چاہیے ورنہ وہ امتحان کیسے دے سکتا ہے۔ اس لیے اسلام نے قتل کو سنگین جرم قرار دیا اور مجرم کو ایسی ہی سنگین سزا کا مستحق قرار دیا۔ جو لوگ اس سنگین سزا کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ دراصل موت کے بعد کسی زندگی کے قائل نہیں ہیں۔ بس یہی زندگی ہے، اس لیے جو مقتول ہے وہ تو مرگیا اور اب جو زندہ ہے (قاتل) وہ تو زندگی سے محروم نہ رہے، لطف اُٹھائے۔ یہ خالص مادّی اور حیوانی نقطۂ نظر ہے۔ زنا اسلام کے نزدیک سنگین جرم ہے۔ وہ اس کے لیے بھی سنگین سزا دیتا ہے۔ یہ اس لیے کہ خلافت کے امتحان کے نقطۂ نظر سے امتحان جاری رکھنے کے لیے انسانوں کی آمد کا تسلسل جاری رہنا چاہیے۔ انسانی بچہ جانوروں کے بچوں کے برخلاف بلوغ تک والدین کی نگرانی اور شفقت میں رہتا ہے۔ بڑی مدت کے بعد بالغ ہوتا ہے۔ اس کی تربیت کے لیے خاندان کا وجود ضروری ہے۔ جہاں سے تربیت پاکر نووارد زندگی کے

امتحان میں داخل ہوتے ہیں اور اپنا پرچہ دیتے ہیں۔ اپنا نامۂ اعمال تیار کرتے ہیں۔ زنا کاری اس سارے سلسلہ کو نظر انداز کرنے بلکہ ختم کر دینے کے مترادف ہے۔ وہ صرف جانوروں کی سطح پر ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا نام ہے۔ بعد کے اثرات اور نتائج سے وہ بے تعلق ہے۔ ایک مسلمان جس کے نزدیک آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے اور یہ دنیا کی زندگی تیاری کی زندگی ہے وہ کیسے اس ساری اسکیم کو تلپٹ ہوتے برداشت کرے۔ اسی طرح قتل، زنا، چوری، ڈاکہ وغیرہ کا تعلق انسان کے بنیادی تصورات اور انسان کی بنیادی اسکیم سے ہے۔ فرد کو تحفظ دینے کے لیے اسلام نے ان سنگین سزاؤں کا اہتمام کیا ہے۔ ان سزاؤں کو اللہ تعالیٰ نے خود نافذ کر دیا تاکہ انسانی عقل اپنی تلوّن مزاجی سے اس میں مداخلت نہ کرے۔ یہ سزائیں مقدس بن جائیں۔

انسانی عقل کی تلوّن مزاجی کا یہ حال ہے کہ ایک جانب اٹلی میں اور یورپ کے بعض دوسرے ملکوں میں سرے سے قتل کی سزا ہے ہی نہیں۔ دوسری طرف جنوبی امریکہ میں ایک گورے کے بدلے میں دو اور تین کالے قتل کیے جاتے ہیں۔ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ امریکہ میں کالوں کو سنگسار (LYNCHING) کرنے کا حق عوام گوروں کو حاصل تھا۔ حدود اللہ اس تلوّن مزاجی کا علاج ہے۔

اسلامی قانون کا دوسرا حصہ قابلِ تغیر ہے۔ تمدنی حالات میں تغیر آتا رہتا ہے۔ معیشت و معاشرت میں تغیرات آتے رہتے ہیں، جن کے باعث انسان کے اوضاع و اطوار میں بھی تغیرات آجاتے ہیں۔ اس لیے تغیر پذیر حالات سے مطابقت ضروری ہے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم پر اجتہاد کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس اجتہاد کے لیے چند شرائط ہیں:۔

۱ ـــ حدود اللہ اور نص صریح کی مخالفت نہیں ہو سکتی ـ یہ اجتہاد قرآن و سنت کے دائرہ میں رہ کر ہوگا۔ اس قانون سازی میں انسان بنیادی قانون کا پابند ہوگا۔ مطلق العنان، شتر بے مہار اور فیل بے زنجیر نہیں ہو سکتا۔

۲ ـــ اس اجتہاد میں انسان کی بنیادی اسکیم ـــ انسان کا خلیفۃ اللہ ہونا، دنیاوی زندگی کا ایک امتحان ہونا ـــ کو پیش نظر رکھا جائے۔

۳ ـــ آخرت میں اعمال کی جواب دہی کا تصور ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے۔

۴ ـــ علم و فضل اور تقویٰ کے لحاظ سے جو لوگ اہل ہیں [illegible] ہی اجتہاد کر سکتے ہیں [illegible] (باقی صفحہ ۴۴ پر)

اسلامی تشکیلِ تعلیم

اردو سائنس بورڈ کا سوال نامہ اور جوابات

نعیم صدیقی

(۲)

سوال نمبر (۳)

نصابات اور نصابی کتابوں کے متعلق پہلے کئی بار اہلِ علم کے مشوروں اور ماہرینِ تعلیم کی آرا کی روشنی میں نقشۂ کار بنے لیے سال کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ نیز بڑی بڑی عالمی، اسلامی اور دینی یونیورسٹیوں اور ان کے ماتحت تعلیمی بورڈوں سے نصابات حاصل کرکے جائزہ لینا۔

نصاب مرتب کرتے ہوئے ہر سطح کے لحاظ سے دو باتیں طے کرنی ہوں گی:

ایک یہ کہ آج تک کے فلسفوں، علوم انسانی اور علوم تجربی کے فراہم کردہ سرمایۂ دانش سے کیا کیا کچھ درجہ بدرجہ لینا ہے۔

دوسرے یہ کہ ان علوم پر جوانانِ پاکستان کی خودی اور ان کے ایمان کی گرفت کو مضبوط رکھنے کے لیے عقاید، افکار، احکام اور علمی و اجتہادی کاموں، نیز اپنی مادی اور تجربی ترقیات سے کتنا کچھ شامل کرنا ہے۔

یہ نازک کام اس طرح ہونا چاہیے کہ دو الگ الگ علمی دھارے نوجوانوں کے ذہنوں میں نہ بہنے لگیں۔

ایک دینی اور ایک دنیوی (یا لادینی) ۔ اور اس طرح بھی نہیں ہونا چاہیے کہ دونوں علوم یعنی ایک الہامی علم ہدایت اور دوسرے قیاسی، حواسی اور تجرباتی علم کو آپس میں ٹکرا دیا جائے ۔ اور مستقلاً ہر ذہن میں ایک اُلجھاؤ پیدا کر دیا جائے ۔ یا ایسے الگ الگ گروہ اُبھر کھڑے ہوں جو برسرِ کشمکش رہیں، مگر اسلام ہی کے برتر مقاصد کے لیے تعاون نہ کر سکیں۔

اب ہمیں الگ الگ طالب علموں کے گروہ جمع کر کے کسی کو مذہبی عالم اور کسی کو سائنس دان اور ڈاکٹر اور انجینیر بنانے کا طریقہ ترک کر دینا چاہیے ۔ (ہو سکتا ہے کہ اس نقشہ کے اول بنیادیں بننے میں سال لگ جائیں کیونکہ دو طرفہ ذہنوں اور ان کی قیادتوں میں اعتماد پیدا ہو جانا چاہیے) ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان مفسر اور مسلمان قانون دان اور مسلمان قاضی کی طرح مسلمان ڈاکٹر اور مسلمان انجینیر اور مسلمان ماہرین جوہری توانائی اور مسلمان کمپیوٹر ایکسپرٹ یا مسلمان خلا باز ہم ایک ہی نظامِ تعلیم سے حاصل کریں ۔ یہ سب لوگ ایک ہی نظریاتی، اخلاقی اسپرٹ اور فلاحِ انسانیت کے ایک ہی نصب العین سے سرشار ہوں ۔ شاید یہ وحدانی سسٹم تشکیل پانے میں کچھ وقت لے گا۔

جہاں تک نصابی کتابوں کا تعلق ہے، اس تصور کے ساتھ تیار کی جائیں کہ ہمیں خدا کی زمین پر، خدا کے خلیفہ کی حیثیت سے، اس کے تفویض کردہ فرائض کو، اس کی ہدایات کے مطابق ایک امتحان کی طرح انجام دینا ہے ۔ یہ پس منظر جس بھی مضمون کے ساتھ، ادنیٰ یا اعلیٰ درجوں میں کام کرے گا اس مضمون میں روح پیدا ہو جائے گی کہ کرگھا چلانے والا ایک مزدور، میزائیل چھوڑنے والا ایک سپاہی، معلومات کے نئے نئے شکار کرنے والا ایک خلا نورد یہ جذبہ رکھے گا کہ میں اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کر رہا ہوں لہٰذا یہ مقامِ عبادت ہے ۔

ہمیں چاہیے کہ ہر مضمون کے لیے پہلے موجود اور مروج کتابوں پر نظر ڈالیں ۔ مثلاً نفسیات کے بارے میں آپ ولیم جیمز، فرائیڈ، ینگ، ایڈلر، برٹرینڈ رسل وغیرہ بے شمار مفکرین کی کتابیں (اور ان کے ضروری حصے یا خلاصے) سامنے رکھیں ۔ اِدھر سے آپ نفسیاتی احوال کے متعلق قرآن کی آیات (مع مختلف مفسرین کے تفسیروں کے مباحث کے)، حضورِ پاک کی خاص خاص احادیث (اور ان کی شروح) کو سامنے رکھیں، پھر مؤلف اخلاقِ جلالی اور تصانیف امام غزالی و دیگر تصانیف کو سامنے رکھیں، علاوہ ازیں دورِ حاضر میں جن مسلم اہلِ فکر نے مغربی نفسیات پر تنقید کرتے ہوئے اسلامی نقطہ نظر سے کوئی کتاب یا مقالہ

لکھا ہو وہ بھی جمع کر لیں ۔ پھر آپ کے نظامِ تعلیم کے لیے نصابی کتابیں لکھنے والے ان دو طرفہ معلومات کو اس طرح جمع کریں کہ اسلامی حکمتِ نفسیات غالب رہے ۔ مثلاً جدید نفسیات ہمیں ہر طرف سے گھیر گھار کر نفسیاتی جبریت کے کلیۃً تک لے آتی ہے ، جس میں انسان جکڑا ہوا ہے ۔ مگر اسلامی نفسیات یہ بتاتی ہے کہ نفس میں کام کرنے والی قوتوں کے تانے بانے کو توڑ کر جب چاہے انسان خودی اور قوتِ ارادی کے زور سے آزاد ہو سکتا ہے ، ہاں اگر وہ اس حالت پر راضی ہو کر (تن بہ تقدیر) پڑا رہے تو پھر نفسیاتی قوتیں مختلف قسم کے جالے ـــ مثلاً عادت کا جال ـــ اس کے گرد لپیٹتی رہتی ہے ۔ اس کے باوجود اسلامی تصور یہ ہے کہ انسان کی خودی اتنی زبردست چیز ہے ، دوسرے لفظوں میں اس کی قوتِ ارادی اور قوتِ فیصلہ جب ایک بار آگ آتی ہے تو پھر اگر اس کے اوپر سِل بھی رکھی ہو تو وہ سِل کو بھی چیر کر باہر آجاتی ہے ۔

اس طرح تمام علوم میں کوشش کی جا سکتی ہے ۔

ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بڑی کلاسوں میں بعض موضوعات پر بعض تصنیف شدہ معیاری کتابیں اور بعض صورتوں میں قومیت ، اقتصادیات ، بنکنگ بلا سود ، اسلامی قانون وغیرہ کے متعلق ملک بھر کے اچھے اچھے مقالات کے مجموعے مرتب کر لیے جائیں ۔ عالمِ اسلام کے دوسرے لوگوں کی کاوشوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے ۔

کچھ پہلو ایسے ہوں گے اور مسائل آئیں گے جن کے لیے استاد یا لیکچرر کو بطور خود لیکچر یا سبق تیار کرنا ہو گا ۔ ایک یا زیادہ ۔

اس قسم کے عبوری تجرباتی دَور کے بعد مستقل نصابی کتابیں ہر سطح پر اور ہر علم کے لیے فراہم ہو جائیں گی ۔ اس کے لیے ملک بھر کے مفکرین و مصنفین کو اچھے معاوضوں پر مقرر کردہ مقاصد اور خاکوں کے مطابق کتابیں لکھنے کے لیے تیار کیا جا سکتا ہے ۔

سوال نمبر (۴)

دراصل یہ سوال کیا ، سارا ہی سوالنامہ ایک کتاب لکھنے کا متقاضی ہے اور مختصر بھی لکھا جائے تو سوچنے کے لیے خاصا وقت چاہیے ۔

اس سوال کے تحت میں صرف پانچ چیزوں کا ذکر کروں گا ـــــ

۱ ـــ درس گاہ اور گھر کا رابطہ : اُستاد جو کچھ بچوں کو یا بڑے طالب علموں کو سکھانا چاہتا ہو، علمی سطح پر یا اخلاقی و سماجی سطح پر، اس سے وہ متعلقہ گھروں کو آگاہ رکھے کہ وہ اپنے ماحول کو اس کے تعلیمی پروگرام سے ہم آہنگ رکھیں اور گھر کا ادارہ کوئی تضادات اور مزاحمتیں نہ رکھتا ہو۔

۲ ـــ ملک کے ذرائع ابلاغ جو پورے معاشرے میں ایک خاص طرزِ فکر، ایک خاص معاشرتی معیار اور ایک خاص تہذیب و ثقافت پھیلا رہے ہوتے ہیں ـ ان کو حکومت تعلیم کی اسکیم سے ہم آہنگی اختیار کرنے کا پابند کرے ـ طلبہ اور نوجوانوں کے لیے جو نظریہ، نصب العین اور اخلاقی قدریں اور خدمتِ انسانیت کے مقاصد قومی تعلیم کے لیے طے کیے گئے ہیں ان سے کوئی ادارہ انحراف نہ کرے اور ان سے ٹکراؤ پیدا کرنے والا مواد نہ لائے ـ

۳ ـــ اُستاد کو تعلیمی ترقی کا اصل ضامن قرار دے کر اُسے پوری پوری اہمیت دی جائے ـ اِس پیشے میں آنے والوں کی صرف تعلیمی استعداد ہی کو نہ دیکھا جائے، بلکہ ان کے خاندانی ماحول کی چھان بین کی جائے کہ آیا پہلے سے وہ فروغِ علم اور خدمتِ انسانیت کے ماحول سے متعلق چلے آ رہے ہیں یا نہیں ـ ان کے معیارِ اخلاق و شائستگی کا اندازہ لگایا جائے ـ پھر اُن کو بہت اعلیٰ درجے کی تربیت دی جائے اور معاشرے میں ان کو اعلیٰ مقام اعتبار دیا جائے ـ نفسیاتی طور پر ان کو حلیم اور محبت کیش اور مدبر ہونا چاہیے ـ

اساتذہ کے اجلاس، اساتذہ کے سیمینار، اساتذہ کے ریفریشر کورس صرف اس مقصد کے لیے ہوں کہ توسیعِ تعلیم کے ساتھ ساتھ معیارِ تعلیم اور مقصدِ تعلیم کا حصول کیسے ہو، اور مختلف مدارج اور مختلف مضامین سے متعلق اساتذہ اپنی ذمہ داریاں کیسے پوری کریں ـ

ہر سال دو سال بعد وہ خاص تعلیمی امتحانات اسی طرح پاس کریں جیسے فوج کے سپاہی اور افسران درجہ بدرجہ پاس کرتے اور آگے بڑھتے رہتے ہیں[1]۔

---

[1] اس طریقے سے ان کو جدید ترین معلومات و تجربات سے آگاہ رکھا جائے ـ

۴ ۔۔ امتحانات سمسٹر سسٹم کے تحت ہی لیے جائیں، البتہ اس سسٹم کے کمزور رخنوں کو بند کر دیا جائے۔

۵ ۔۔ تعلیمی ترقی کی رفتار بڑھانے اور اخلاق شدھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ مخلوط تعلیم کا قطعی اور فوری انسداد کر دیا جائے۔

سوال نمبر (۵)

میرا خیال ہے کہ اس سوال کا جواب نمبر ۳ کے جواب میں آ گیا ہے۔

سوال نمبر (۶)

فوری رائے قائم کرتے ہوئے اچھے اچھے مفکرین تک یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ تعلیم گاہوں میں اساتذہ یا طلبہ کی تنظیمیں نہ ہونی چاہئیں۔ بلکہ بہت سی خرابیوں کا علاج ہی اس کو سمجھتے ہیں کہ اساتذہ کی تنظیمیں اور طلبہ کی یونینیں نہ رہیں۔ حالانکہ اس منفی تجربے کا نتیجہ بدتر نکلا ہے۔ مگر نتائج کا کبھی کسی وزیر یا ماہرِ تعلیم نے اندازہ ہی نہیں لگایا۔

یہ فارمولا اگر درست ہوتا تو ملک کے تمام شعبوں کو یونینوں اور تنظیموں اور تحریکوں کو خالی کر دینا چاہیے تھا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس معاشرے کی ساخت یہ ہو کہ کچھ لوگ دوسروں کے حقوق چھینتے ہوں اور کچھ دوسرے مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے حقوق کے لیے آواز اٹھائیں، وہاں تنظیموں کو آپ کیسے روک سکتے ہیں جو آواز اٹھانے کا ذریعہ ہیں اور جن کے ذریعے کسی اقدام کے حق میں یا اس کے خلاف اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی قوت اُدھر پائی جاتی ہے۔

جہاں رشوتیں اور سفارشیں اور جنبہ داریاں بڑھ گئی ہوں اور اس کی وجہ سے استادوں اور طالب علموں میں سے کچھ کو ناجائز فائدہ پہنچایا جائے اور کچھ کو بے جا تکلیف میں ڈالا جائے وہاں اگر تنظیمی قوت کو ضبط و نظم کے ساتھ کوئی اخلاقی مطالبہ نہ کرنے دیں گے یا رد کر دیں گے تو چاہے آپ تنظیم کو توڑ دیں، فضا کو پرسکون

اور پُرامن نہیں بنا سکتے۔

پھر دوسرا ہمارا یہ قضیہ نظریاتی رابطوں اور ان کی وجہ سے تعصباتی حمایتوں اور مخالفتوں کا ہے۔ اس قضیے میں یونیورسٹی کے حکام، پروفیسر اور طلبا سب کسی نہ کسی حد تک شریک ہوتے ہیں۔ پھر اس معاملے میں زیادہ غورطلب حقیقت یہ ہے کہ بائیں بازو کی قوتیں بہت پہلے سے زندگی کے ہر دائرے میں ـــــ ٹیلی وژن، ریڈیو، اخبارات، محکمہ جاتی دفتروں اور درسگاہوں میں ـــــ اپنے آدمیوں یا حامیوں کو منظم کر کے ان کی سرپرستی کرتی چلی آرہی ہیں۔ جب تک یہ یک طرفہ عمل جاری تھا اور ان کا واسطہ زیادہ سے زیادہ لادینی قسم کی یا زیادہ سے زیادہ قوم پرستانہ تنظیموں سے تھا تو امن تھا اور یونین ازم کے خلاف کبھی کوئی آواز نہیں اُٹھی۔ لیکن جونہی اس یک طرفہ جارحیت کے خلاف اسلامی جمعیت طلبہ اسلامی نظامِ تعلیم کی آواز لے کر میدان میں آئی معاملہ بگڑ گیا۔ پہلی دفعہ ایوبی دَور میں انتخابات کے سلسلے میں جمعیت کے قائدین کو مارا پیٹا گیا۔ یوں تشدد کا آغاز ہوا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور اگر باقاعدہ انکوائری ہو تو پشاور سے لے کر کراچی تک صاف معلوم ہو جائے گا کہ تشدد کا نشانہ زیادہ سے زیادہ بار جمعیت والے بنے ہیں۔ اور اگر انہوں نے کوئی کارروائی کی ہے تو وہ جوابی اور دفاعی تھی۔ پھر ستم یہ ہوا کہ ایوب صاحب کے دَور کی طرح متعدد بار ـــــ اور خصوصاً ان دنوں ـــــ حکومت بھی جمعیت کے خلاف سرگرم رہی ہے۔ اس اصولی گفتگو سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ "جمعیت" غلطیوں سے مبرا ہے۔

اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ اگر حکومت غیر جانب دار رہنے کا فیصلہ کرے اور یونیورسٹی کے حکام ناجائز حمایتیں اور مخالفتیں چھوڑ دیں تو پوری محنت اس ماحول کو پیدا کرنے میں صرف کی جائے کہ اختلافات کے معاملہ میں کیا رویہ ہونا چاہیے۔ استاد اس رویّے کا عملی مظاہرہ کریں اور طلبہ سے اس پر عمل کرائیں۔

اب تنظیموں کے دائرۂ کار کو لیجیے۔ کوئی تنظیم اگر اسلامی تعلیمات کو پھیلاتی ہے یا نئے طلبہ کو مدد دیتی ہے، یا درسگاہوں کو رقص و سرود کی اخلاق سوز سرگرمیوں سے پاک رکھنے کا مطالبہ کرتی ہے، یا ملکی ماحول کے اخلاقی بگاڑ کے خلاف غیر سیاسی طور پر آواز اُٹھاتی ہے تو ایسا کرنا جائز ہی نہیں، بہت ضروری ہے۔ اسی طرح انتخابات کے زمانے میں اس کے ارکان ووٹ دے سکتے ہیں، کسی بھی شخص یا جماعت کی حمایت یا مخالفت کر سکتے ہیں۔ بس اس سے زیادہ سیاساتِ ملکی میں ان کا کوئی کام نہیں۔ رہا دین کی دعوت اور تعلیم کو پھیلانے کا کام سو اسے وہ اپنے معاشرے میں کُھلم کُھلا کر سکتے ہیں اور دینی لحاظ

سے جن بھی افراد یا جماعتوں سے چاہیں، استفادہ اور رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی طرح اساتذہ کی ایسی تنظیمیں جو اسلامی فلسفۂ تعلیم، مسلم ماہرین تعلیم کے افکار اور تعلیمی مباحث و مسائل پر رہنمائی مہیا کرتی ہوں، اساتذہ اور طلبہ کو اسلامی نظریۂ تعلیم کے تحت رہنمائی دیتی ہوں، وہ تو بہت بڑا اثاثہ ہیں۔ ناجائز یہ بھی نہیں کہ کسی استاد کی بے جا حمایت و مخالفت کے متعلق یا طلبہ پر ہونے والی کسی زیادتی کے متعلق، یا تعلیمی پالیسی کی کسی حکومتی غلطی کی طرف یا استادوں کے حقوق کی طرف وہ توجہ دلائیں۔

جہاں جمہوری نظام ہوگا وہاں یونینیں اور تنظیمیں تو ہر شعبے میں ہوں گی۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ انہیں اسلامی فکر و اخلاق کے چینل میں رہنے پر آمادہ کریں۔

یقین جانیے کہ اسلامی نظامِ تعلیم کم سے کم تعلیمی ایڈمنسٹریشن میں اپنی نشوونما کے لیے دیانت اور شرافت کا جو رنگ چاہتا ہے، وہ اگر پیدا کر لیا جائے تو پھر تعلیم گاہوں میں کوئی تصادم باقی نہیں رہ سکتا یہ رنگ جب پھیلے گا تو استادوں اور طلبہ سب کی روحوں پر چھا جائے گا۔ اور یہ کام نہ ہو سکے تو آپ یونینیں توڑیں یا بنوائیں، کبھی پُر سکون تعلیمی ماحول پیدا نہ ہوگا، اور نہ اسلامی نظامِ تعلیم کی نشوونما ہو سکے گی۔

پس میں ان گذارشات کے ساتھ اپنی معروضات کو ختم کرتا ہوں اور معذرت چاہتا ہوں کہ بات مجمل نہ رہ سکی۔

موجودہ نظامِ تعلیم کی تبدیلی

(ایم اے ایجوکیشن کی ایک طالبہ کے سوالات)

سوالات

۱۔ موجودہ نظامِ تعلیم سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

۲۔ کیا یہ نظامِ تعلیم قومی مقاصدِ تعلیم کو پورا کرتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہوگا کہ اس نظامِ تعلیم کی

خامیوں کی نشاندہی فرمادیں۔

۳۔ کیا یہ درست ہے کہ موجودہ ناقص نظامِ تعلیم کی وجہ سے قوم طبقات کا شکار ہو گئی ہے؟

۴۔ طبقاتی نظامِ تعلیم کو ختم کرنے کے سلسلے میں آپ کی کیا تجاویز ہیں؟

جواب: از نعیم صدیقی

۱۔ موجودہ نظامِ تعلیم ایک ایسی ٹوپی ہے جو ہمارے سر کے ناپ کے مطابق نہیں بنائی گئی ہے بلکہ یہ تنگ تثلیثی ٹوٹی سر پر رکھ کر ہتھوڑے کی ضربوں سے فِٹ کر دی گئی ہے۔ اور وقتاً فوقتاً فٹ کی جاتی رہتی ہے۔ اس کے کبھی ایک کونے کو بدلنے کے لیے اور کبھی دوسرے زاویے کو درست کرنے کے لیے ٹھکا ٹھک ہوتی رہتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جن کیلوں سے یہ ہمارے سروں پر مستقلاً نصب کر دی گئی ہے وہ کھوپڑی میں اُتر کر اپنی جگہ بنا چکی ہیں، اور اب ہم سوچ بھی نہیں سکتے کہ اسے الگ کر کے کوئی دوسرا بندوبست کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ذرا سی جنبش بھی درد پیدا کرتی ہے۔ یہ ٹوپی جو غلامی میں ہمارے سروں پر ٹھونسی گئی تھی، آزادی میں اس کی پکڑ اور سخت ہو گئی ہے۔

مندرجہ بالا اشارے کا ترجمہ یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم کو ہمارے نظریہ حیات، ہمارے ملی نصب العین، ہمارے بنیادی تصورِ پاکستان، ہمارے شعورِ اخلاق، ہماری معاشرتی قدروں اور ہماری تہذیب سے بلکہ لسانی ذوق و ضرورت اور آزاد قوم کے مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ اُلٹا یہ نظامِ تعلیم ان سارے تقاضوں کو عوامِ ملت کو پاؤں تلے پامال کرتا ہے اور ہماری ہر قیمتی چیز کا مذاق اُڑا اُڑا کر اس نے ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ اِس نے ہماری خودی کو مُردہ، ہمارے ضمیروں کو کشش اور ہمارے سروں کو دوسروں کے سامنے خم کر دیا ہے۔ اب ہماری خاصی بڑی تعداد کو جس میں دانشور اور معلّم اور صحافی اور ادیب اور لیڈر اور وزیر بھی شامل ہیں، ہر وہ بگاڑ اور اذیت اور بے جوڑ پن ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس نظام نے پیدا کر دیا ہے۔ اب اس کے محافظین اور پہرہ دار اور سنتری بھی خود ہمارے گھروں میں مسلمان ماؤں کی گودوں میں، اور مسلمان باپوں کے سایۂ شفقت میں پرورش پا کر ڈیوٹیاں سنبھالے ہوئے ہیں۔

اب تو اصلاحِ تعلیم اور تبدیلیٔ تعلیم کے جو تجربے ہوتے ہیں، وہ بھی اس قدر کہ مشین کا ایک کیل

اِدھر سے نکال کر اُدھر ڈال دیا۔ یا کسی پرزے کی جگہ ذرا مختلف ساخت کا کوئی اور پرزہ ڈال دیا۔ مشین وہی میکانکی ہے۔ یہ تو اتنا بھی گوارا نہیں کرتی کہ ہماری قومی زبان اردو ذریعۂ تعلیم بن سکے۔

۲ — موجودہ نظامِ تعلیم کی بڑی خامی یہ ہے کہ اس نے اسلام کے تصورِ انسان کو تو بالکل درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا، مزید ستم یہ کہ پاکستان کے لیے اس کے نظریے کے مطابق انسانِ مطلوب کا تصور بھی اختیار نہیں کیا کہ جس کو تعلیم کا محور و مقصد بنا کر سارے پہلوؤں کو سوچا جائے۔

یہ نظام نوجوانوں کو اپنے دینی یا تہذیبی وجودِ امتیازی اور جداگانہ تشخص کا شعور دلا کر ان میں اُمنگیں پیدا نہیں کرتا کہ وہ انسانیت کے سامنے زندگی کے زیادہ اونچے اور پاکیزہ تصورات اور کردار کے نمونے لے کے جائیں اور بصد فخر اپنی متاعِ ملّی کو پیش کر کے اس پر اثر انداز ہوں۔ اس طرح نوجوانوں کا تعاون ایک بہترین معاشرت و تہذیب کی تشکیل کے لیے حاصل کیا جائے۔

یہ نظام ہماری نسلوں کو یہ تربیت نہیں دیتا کہ وہ اپنے ایمان اور اپنے ضمیر کے مطابق بہترین اُصولوں اور قدروں اور روایتوں کو پروان چڑھائیں، ان کے چراغوں کو روشن کریں اور ان قیمتی ورثوں کے تحفظ کے لیے انہیں اگر دولت اور ہوسناکی اور بے حیائی اور جاہلی عصبیتوں کی چوکھی لڑائی میں اپنا مجاہدانہ کردار ادا کرنا پڑے تو وہ بصد مسرت لبیک کہہ اور اُچھل اُچھل کر اسے ادا کریں۔

وہ خود اپنے معاشرے میں مشنری اور معلم اور مصلح اور انقلابی بن کر کام کریں اور اس میں راستی اور بھلائی کی ایک رَو چلا دیں۔ مگر آج وہ فلموں اور آڈیو وڈیو کیسٹوں، عریاں تصویروں، کیمرہ بازی اور سیاسی دائروں میں ناچ کود کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دلیل سے بات کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، دلیل سن کر اس سے اثر نہیں لیتے، اختلافات وجہ تشدد و تصادم بن جاتے ہیں۔ ان کو خیانت اور اسمگلنگ اور جرائم کے روگ، اپنا شکار بناتے ہیں۔ گھروں، گلیوں اور سڑکوں پر گندگی ہے، جہاں کہیں ذرا بھیڑ ہو تو دھکم پیل اور شور شرابا بڑھ جاتا ہے۔ ان سارے وجوہ سے ذہنوں میں اضطراب اور اعصاب میں تناؤ ہے، جس کے نتیجے میں قسم قسم کی پیچیدہ بیماریاں انسان کا مقدر بن گئی ہیں

یہ عجیب تعلیم ہے جس کے سائے میں آزادی کے بعد ۴۱ برس سے زیادہ عرصہ گذارنے پر بھی ہم حالتِ خوف میں مبتلا ہیں اور کئی کئی قسموں کے خوف آسیب بن کر ہر فرد پر سوار ہیں۔

۳ — یہ سوال بھی دراصل اُوپر کے سوال ہی سے متعلق ہے۔ ایک سے زیادہ تعلیمی سسٹم

اور معیارات، انگریزی والے اسکول اور اُردو والے اسکول، حاکم و مقتدر طبقے کے بچوں کے لیے درس گاہیں اور عوام کے لیے درس گاہیں، مُلکی مراکزِ تعلیم اور غیر مُلکی مشنری مراکزِ تعلیم، ان چیزوں نے قوم کو ذہنی طور پر طبقاتی جزیروں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۴۔ طبقاتی نظامِ تعلیم کو ختم کرنے کا طریقہ "توحیدی" ذہنوں کے لیے سوچنا کچھ مشکل نہیں۔ ایک ہی معیار و مصارف کے اسکول! ایک ہی نصاب اور نصابی کتب، ایک ہی جیسی وردیاں اور فیسیں، ایک ہی زبان ذریعۂ تعلیم اور ذریعۂ امتحانات۔ اس کے سوا کیا نسخۂ اصلاح ہو سکتا ہے؟

صرف ایک استثنیٰ ضروری ہے۔ ہمارے دینی احکام اور فطرت کے واضح اشارات تقاضا کرتے ہیں کہ خواتین کے لیے جداگانہ یونیورسٹیاں اور کالج ہوں، مگر تعلیمی سسٹم، نصاب، فیسیں، ذریعۂ تعلیم اور معیارات یکساں ہونے چاہییں۔

(بقیہ اسلامی قانون جامد کیوں؟)

قوانین میں ایک حصہ قواعد و ضوابط کا ہے۔ یہ صحیح معنوں میں قانون نہیں ہے، بلکہ معاملات کو سہولت سے سرانجام دینے کے لیے طریقۂ کار ہے۔ اس میں جو بہترین طریقہ ہو اس کو اختیار کرنا چاہیے۔

اس طرح اسلامی قانون، اسلامی شریعت دائمی (RIGID) اور تغیر پذیر (FLEXIBLE) دونوں حصوں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اسلامی قانون انسانی فطرت کے لیے زیادہ سازگار ہے۔ اس لیے یہ ہر زمان اور ہر مکان کے لیے موزوں ہے۔

تصحیح

ترجمان القرآن ماہ دسمبر ۱۹۸۸ء۔ مضمون علامہ ابن تیمیہؒ کا تفسیری ورثہ صفحہ ۱۸۶/۱۹ سطر نمبر ۱۹ میں امام بخاریؒ کے بجائے "امام فراہی" پڑھا جائے۔ (ادارہ)

رسائل و مسائل

سعی بین الصفا والمروہ کی توجیہہ

جناب ملک غلام علی صاحب

سوال: آج مناسکِ حج اور حج کی اہمیت کے موضوع پر مختلف کتب کی ورق گردانی کرتے ہوئے جب مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب کی تالیف "اسلام ایک نظر میں" کا مطالعہ شروع کیا تو اس کے بعض پیراگراف نے سخت الجھن میں ڈال دیا۔ مولانا اصلاحی صاحب اسی کتاب کے ص ۱۶۴ پر "صفا اور مروہ" کی اہمیت بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"دونوں مقامات اللہ کی بندگی کی نشانیاں کس طرح ہیں، تو یہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں تاریخ کی طرف رجوع کرنا چاہیے، جو بتاتی ہے کہ مروہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا تھا تاکہ اسے اللہ کی رضا پر قربان کر دیں۔ اس لیے اسے دیکھتے ہی فطری طور پر مومن کی نگاہوں میں "بندگی" اور اسلام کی وہ تصویر پھر جاتی ہے جسے اللہ کے خلیل اور اللہ کے ذبیح نے اپنے عمل سے کھینچا تھا۔"

اس سے اگلے پیراگراف میں وہ "جمرات" کی توجیہہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ وہ مقامات ہیں کہ جہاں تک کہ حبشہ کے عیسائی حکمران "ابرھہ" کی فوجیں کعبے کو ڈھا دینے کے ارادے سے بڑھ آئی تھیں اور پھر پتھروں سے ہلاک کر دی گئیں۔" "جمرات" کے متعلق صفحہ نمبر ۱۶۳ پر وہ لکھتے ہیں:

"اور ہر روز تینوں "جمرات" کو سات سات بار تکبیر کے ساتھ کنکریاں مارتے ہیں"۔

مزید یہ کہ مولانا اصلاحی صاحب "صفا اور مروہ" کے بارے میں ص ۱۶۸ پر بھی اسی طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

محترمی مندرجہ بالا سطور میں مولانا اصلاحی صاحب کا یہ کہنا کہ "مروہ" وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے فرزند کو زمین کے بل لٹایا تھا، سخت اُلجھن کا باعث ہے۔ ہم ابھی تک یہی پڑھتے اور سنتے آئے ہیں کہ "صفا" اور "مروہ" دو پہاڑیاں ہیں کہ جن کے درمیان حضرت ہاجرہ نے حضرت اسماعیل کے لیے پانی کی تلاش کی غرض سے ' سات مرتبہ سعیؔ کی تھی۔ اور آج بھی اسی سنّت کو زندہ رکھنے کے لیے یہ عمل دہرایا جاتا ہے سخت تعجب کا مقام ہے کہ مولانا صدر الدین اصلاحی صاحب جیسے بلند پایہ مصنّف سے یہاں ایک ایسی بات کے متعلق سہو ہوا ہے کہ جس کا علم ہر خاص و عام کو ہے۔ شاید انہیں علمی مغالطہ ہوا ہو۔ یا پھر حقیقت ہی یہ ہے۔ براہ کرم اصل کتاب سے پورا متن، سیاق و سباق کے ساتھ دیکھنے کے بعد رہنمائی فرمائیں کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ فرض کریں کہ اگر مولانا اصلاحی صاحب کی توجیہہ غلط ہے، تو پھر آج تک جماعت کے کسی صاحب علم نے اس کی نشاندہی نہیں کی۔ یہ بات بھی اپنی جگہ حیرت کا باعث ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ "جمرات" پر کنکریاں مارنے کے عمل کی حکمت اور پس منظر بیان کرتے ہوئے مولانا اصلاحی صاحب کا اس واقعہ کو "ابرھہ" کے لشکر سے منسوب کرنا بھی میرے لیے اُلجھن کا باعث بنا ہوا تھا۔ بالعموم علماء تو اس کی رمز یہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے شیطان کو پتھر مارے تھے اس لیے آج بھی مسلمان ان کی سنّت کو دہراتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اپنے مشہور "خطبات بہاولپور" میں بیان کیا ہے۔ براہِ کرم اس مسئلے کی علمی حقیقت کے متعلق رہنمائی فرمائیں۔

جواب:۔ بلاشبہ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی نے "حج کے مراسم" پر بحث کرتے ہوئے صفا اور مَروَہ کے بارے میں قرآن مجید کی آیت نقل کرنے کے بعد مَروَہ کے شعائر اللہ میں شمار ہونے

کی وجہ یہی بیان کی ہے کہ مَروَہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے فرزند کو پیشانی کے بل زمین پر لٹا دیا تھا۔ اس توجیہہ کو پڑھ کر پڑھنے والے کے ذہن میں وہی اشکال پیدا ہوتا ہے جو آپ نے بیان کیا ہے۔ مولانا صدر الدین صاحب کے بقول تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ مَروَہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لیے لٹایا تھا۔ تاریخ سے غالباً مولانا صدر الدین صاحب کی مُراد وہ تفصیل ہے جو مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اپنی کتاب "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" میں درج فرمائی ہے۔ اِس کتاب کا اصل موضوع یہ ثابت کرنا ہے کہ جس فرزند کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا وہ حضرت اسماعیل تھے، نہ کہ حضرت اسحٰقؑ جیسا کہ محرّف بائیبل میں درج کیا گیا ہے۔ بلاشبہ اپنے اساسی بحث و موضوع پر یہ کتاب قولِ فیصل ہے، لیکن اس میں مور یا اور مروہ وغیرہ پر بحث کے دوران میں جو استدلال کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو جس جگہ قربان کرنا چاہا تھا وہ مَروَہ تھا۔ اس سے ہر قاری کا اتفاق کر لینا لازم نہیں۔ اس کے بالمقابل جو تاریخ یا تاریخی پس منظر ان شعائر اللہ کا صحابہ کرامؓ ہی سے نہیں بلکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث میں وارد ہے، اس سے ہم کیسے انکار یا صرفِ نظر کر سکتے ہیں۔ صحیح بخاری شریف، ابواب الانبیاء میں حضرت ابن عباسؓ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ کے مکّہ معظمہ میں آنے کا وہی واقعہ بیان کرتے ہیں، جس کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ پہلے وہ حضرت ہاجرہ کے ان پہاڑیوں کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑتے سات چکر کاٹنے کو بیان کرتے ہیں، پھر مَروَہ پر حضرت ہاجرہ کے پریشان و سرگردان کھڑے ہو جانے کا ذکر کرتے ہیں، پھر فرماتے ہیں:

قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ذٰلك سعی الناس بَيْنَهُمَا۔	(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اب لوگوں کا ان دونوں پہاڑیوں، صفا و مَروَہ کے درمیان دوڑنا اسی واقعہ کی یادگار ہے۔)

پھر اس کے بعد اس روایت میں ذکر ہے کہ وہاں ایک فرشتہ نمودار ہوا اور اس نے زمزم کے مقام پر اپنے پاؤں یا پروں کو زمین پر مارا اور پانی نکل آیا۔ اس کے بعد حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں:

"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم، یرحم اللہ ام اسماعیل لو ترکت کانت زمزم عینا معینا"۔

(نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ تعالیٰ اسماعیلؑ کی والدہ پر رحم فرمائے اگر اسماعیل کی والدہ زمزم کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی تو ایک چشمہ جاری ہو جاتا - اس کے بعد حدیث میں مروی ہے کہ فرشتے نے حضرت ہاجرہؓ سے کہا کہ کسی آفت و ہلاکت کا خوف مت کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہوگا جسے یہ بچہ اور اس کے والد تعمیر کریں گے - پھر حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت بیت کا مقام اردگرد کی زمین سے اونچا اٹھا ہوا ایک ٹیلہ تھا - اگر ندی نالوں کی شکل میں بارش کا پانی آتا تھا تو وہ اس ٹیلے کے دائیں بائیں جانب سے گزر جاتا تھا)۔ اس کے بعد اس روایت میں قبیلہ جرہم کے یہاں آکر حضرت ہاجرہؓ کی اجازت سے آباد ہو جانے کا ذکر ہے اور یہ بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ وقتاً فوقتاً اہل و عیال کی خبر گیری کے لیے آتے جاتے رہتے تھے، اور باپ بیٹے نے احکامِ الٰہی کی تعمیل میں یہاں بیت اللہ کو تعمیر فرمایا۔

یہاں مزید ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر مروہ وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو لٹایا تھا کہ اُسے اللہ کی راہ میں قربان کر دیں تو پھر مروہ کے ساتھ صفا کو بھی شعائر اللہ میں شمار کیے جانے کی توجیہہ کیا ہوگی۔ اور دونوں کے مابین چکر کاٹنے یا دوڑنے کی کیا تاویل کی جائے گی؟ اللہ کے حکم کی بجا آوری کے لیے بھاگ دوڑ یا تگ و دو کے الفاظ محاورۃً تو ضرور استعمال ہو سکتے ہیں مگر یہاں تک قربان گاہ تک جانے لے جانے کا تعلق ہے اس میں سات چکر لگانے اور ایک پہاڑی سے دوسری تک گھومنے کا کوئی قرینہ جب تک اس کی وضاحت نہ ہو، ناقابل فہم معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

اسی طرح تین مقامات پر رمی جمرات کی یہ توجیہہ کہ یہ وہ مقامات ہیں جہاں تک کہ حبشہ کے عیسائی حکمران ابرہہ کی فوجیں بڑھ آئی تھیں اور پھر پتھروں سے ہلاک کر دی گئیں، یہ بات اس تصریح کے ساتھ احادیث و آثار میں کہیں نظر سے نہیں گزری - میرے علم کی حد تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد ایسا مروی نہیں جس میں رمی جمرات کا کوئی تاریخی پس منظر بیان کیا گیا ہو - البتہ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول

مسند احمد، مجمع الزوائد، طبرانی وغیرہ میں منقول ہے کہ جمرۃ العقبہ جمرۃ الوسطیٰ اور جمرۃ القصویٰ پر شیطان حضرت ابراہیمؑ کے سامنے نمودار ہوا اور انہوں نے تینوں مقامات پر شیطان کو سات سات کنکریاں ماریں۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول اگرچہ حدیث مرفوع نہیں ہے مگر کتاب وسنت کی کسی نص سے معارض بھی نہیں ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک اسے چھوڑ کر ایک نئی تاریخی توجیہہ کو اختیار کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس سے بہتر اور محفوظ تر بات تو یہ ہو سکتی ہے کہ رمی جمار کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے اور غیر منصوص تاریخی پس منظر کی فکر زیادہ نہ کی جائے۔ آنحضورؐ کے ارشاد مبارک خذوا عنی مناسکم (مجھ سے حج کے مناسک اخذ کرو) کی تعمیل کے لیے یہ کافی ہے۔

اس ضمن میں میرا ایک جواب رسائل و مسائل حصہ ہفتم میں بھی موجود ہے جو "طلوع اسلام" کے ایک اعتراض کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ اور جس کا عنوان ہے: "اسوۂ ابراہیمؑ کے ناقدین" براہ کرم اسے بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اس سوال و جواب میں سائل نے پہلے حضرت ابراہیمؑ کے اس واقعہ کا حوالہ دیا تھا کہ انہوں نے اپنی زوجہ محترمہ حضرت ہاجرہ کو حکم خداوندی سے "وادی غیر ذی زرع" میں چھوڑ دیا اور جب آپ وہاں سے چلنے لگے تو آپ کی بیوی نے پوچھا کہ آپ ہمیں یہاں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ کیا اللہ کے حکم سے ایسا کر رہے ہیں تو آپؑ نے جواب دیا ہاں...... اس واقعہ کے بارے میں "طلوع اسلام" فروری ۱۹۶۷ء میں لکھا گیا تھا کہ:

"یہ واقعہ قرآن شریف میں نہیں، تورات میں ہے اور وہیں سے ہماری کتابوں میں درج کر دیا گیا ہے اور اسی کو مودودی جیسے مفسر عام کرتے چلے آ رہے ہیں تاکہ سوچ سمجھ سے کام لینے والے طالب علم اسلام سے برگشتہ ہو جائیں".......

میں نے رسائل و مسائل مذکورہ جواب میں ایسے اعتراضات کو نقل کرنے کے بعد ان کا مفصل جواب دیا تھا۔ (غ-ع)

مطبوعات

مصنفین اور ناشرین سے بہت معذرت چاہتا ہوں کہ کتابوں کا جتنا بڑا ڈھیر میرے سامنے ہے اس کے لحاظ سے صفحات بہت ہی کم ہیں۔ کئی کئی اہم اور ضخیم کتابوں کو چھوڑ کر چند ضروری اور مختصر مطبوعات پر نوٹ لکھ رہا ہوں۔ خوشنویس صاحب نے آخری لمحے تین چار صفحے کے "مطبوعات" نکال کر سامنے رکھ دیئے کہ بس اب دو تین صفحات رسالہ کے بقدر اور لکھ دیں۔ امید ہے کہ عذر قبول ہوگا۔ (مدیر)

MAN EVOLVED OR CREATED — از جناب احمد خضر زبیری۔ ناشر: اسلامک ریسرچ اکیڈمی ۱۰-سی ۱۶۳ منصورہ۔ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی ۳۸۔ انگریزی کتاب —

صفحات: ۱۷ قیمت نامعلوم۔

اٹھانے کو تو میں نے یہ پمفلٹ اٹھا لیا۔ مگر جب پڑھا تو بہت سی باتیں بحث طلب معلوم ہوئیں۔ اگرچہ میرا دائرہ ٹیکنیکل بحث کا نہیں ہے۔

پمفلٹ نظریہ ارتقاء، حیوانی ارتقاء اور انسانی ارتقاء کے حق میں مؤثر تجزیہ ہے۔ مگر جس مذہب دشمن فکری ماحول میں مادی نقطہ نظر پروان چڑھا اس نے جو علوم پیدا کیے، ان میں سے ایک تو خدا کے وجود کو خارج کر دیا گیا ہے۔ یعنی کائنات ایک خودکار مشینری ہے جس کے ہر حصے اور ہر مخلوق میں آٹومیٹک طور پر ارتقاء ہو رہا ہے۔ یہاں تک تو بات نظری قصہ رہتی ہے۔ اس سے آگے یہ ہوا کہ کائنات میں نظم و قانون تو ثابت و واضح ہوتا گیا۔ مگر ناظم و قانون کی کامل نفی کر دی گئی۔ پھر نظریہ ارتقاء کی بنا پر انسان کا حیوانی تصور نمودار ہوا جس نے اخلاقی زاویے بدل دیئے، پھر ایک فلسفہ تاریخ پیدا ہوا

جس میں قوت کے لیے یہ حق تسلیم کیا گیا کہ وہ ضعیف کو محو کر دے تاکہ خیر و خوبی نشوونما پا سکے۔ پھر طبقوں اور قوموں کے درمیان بھی اسی اصول کا رفرما ہوا کہ وہ حیوانی اور معاشی وجوہ سے ہمیشہ باہم آویزاں رہتے ہیں اور کمزور کے لیے قانون بھی ہے کہ ؎

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اس طرح خون ریزی اور انسان آزاری کے لیے وہ اباحیت اور دوسروں سے لوٹ مار کرنے اور ان کے حقوق و املاک چھین لینے کا وہ عالمی نظام نشوونما پاتا گیا جس کے دردناک نتائج سے دنیا بھر گئی ہے۔ حیوانی یا جسمانی ارتقاء کے قیاسی فلسفے کو خالی نظریہ نہیں آپ فیکٹ بھی مان لیں تو وہ پہلا انسان جس کے متعلق خدا نے کہا تھا کہ "نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي" اس کو اخلاقی و تمدنی زندگی کے لیے تمام حیوانات سے الگ دیکھنا ہوگا اور اس کے اندر "نفخ روح" کی وجہ سے جو امتیازی تجربات پیدا ہوئے اور جنہوں نے اسے خلیفۃ الارض اور تمام حیوانات و اشیاء پر حاکم بنا دیا، اصل توجہ ہمیں ان پر دینی ہوگی۔ اسی کے لیے کہا گیا تھا کہ بات صرف ایک "اُلوہی چنگاری" تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ تمہیں انتظار کرنا ہوگا: فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ - (بقرہ ۲-۳۸)

ستم یہ ہوا کہ قبلِ شعور کے جسمانی تشکیلی سلسلہ ہائے عمل کو (انسان کے لیے وہ تھے یا نہیں تھے یا دوسروں سے مختلف پیمانہ پر تھے) سامنے رکھ کر دانایانِ فرنگ اور ان کے شاگردانِ مشرق نے انسان کی اخلاقی و تہذیبی زندگی یعنی تاریخ پر بھی اسے قانونِ اعلیٰ بنا کر نافذ کر دیا۔ اس غلطی کی وجہ سے جو تباہیاں دنیا میں پھیلیں، اقوام کو جس طرح ظلم کے خراس میں پیلا گیا۔ دھوئیں، آگ، خون اور لاشوں کے جو مناظر زمین پر پھیلے وہ کم سے کم یہ تو ثابت کر دیتے ہیں کہ انسان اپنی انسانی زندگی میں ارتقاء سے محروم ہو کر پسپا ہوا۔ اور اگر یہ منطقی نتیجہ تھا جسمانی نظریہ ارتقاء کا تو پھر ہر وہ نظریہ جو صحیح اساسی باطل ہے جو انسانی زندگی سے حسن و خیر کو سلب کرے۔

دینِ توحید کیوں نہیں! جناب مولانا وحید الدین خان۔ ناشر: رابطۃ العلوم الاسلامیہ۔ ۲۶۸۔ عالمگیر روڈ، کراچی۔

بڑے ذہین مولانا ہیں۔ ادبی طرزِ بیان کے ذریعے ابلاغ کی مہارت رکھتے ہیں۔ اپنے سوا شاید ہر ایک سے اختلاف رکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی عجیب قسمیں دکھائی دیتی ہیں۔ مگر "اسلام نظر نہیں آتا"۔ اور "حقیقی اسلام کا کہیں وجود نہیں"۔ یہ بیماری ہمارے ہاں اتنی عام ہے کہ ہر اہم فرد اور ادارہ اور گروہ جو اسلام کے لیے کام کرتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ اسلام کہیں نہیں ملتا ـــ اور اس کے آگے ڈیش پورا کر لیجیے کہ "صرف اپنے ہاں ملتا ہے"۔ اس بیماری نے مسلمانوں سے متحد ہونے کی صفت سلب کر لی ہے۔

فرمایا کہ "قوم کے اندر بگاڑ انکارِ دین کے نام پر نہیں آتا، بلکہ اقرارِ دین کے جلو میں آتا ہے"۔ وہ فرماتے ہیں کہ "کتاب اللہ کے بجائے کتاب الامانی (من گھڑت تصورات) ان کے دین کا ماخذ بنی ہوئی ہے"۔ ٹھیک تو ہے۔ مگر اس کو دلدل سے بچا کر نکالا کیسے جا سکتا ہے۔ خیر دین کے حوالے سے من گھڑت باتوں کی خاصی تفصیل ہے جو مفید مطالعہ ہے۔

گمراہوں کی ایک قسم یہ بھی بتائی ہے کہ:

"یہی صورت ان لوگوں کے ساتھ پیش آئی کہ جو دین کو اسٹیٹ کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ذہن کی وجہ سے دین کو ایک ریاستی نظام کے روپ میں دیکھنے لگے ہیں۔ دین ان کے لیے حکومتی امور کا موضوع ہے، نہ کہ حقیقتہً ذاتی اصلاح کا موضوع!"

اب سوال یہ ہے کہ ایک تو جناب والا ہر بحث اور موضوع میں اس خاص گروہ کو ایک جنگلے میں بند کر کے خوب چابک مارتے ہیں۔ پھر تبلیغِ دین شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے پچھلا گناہ معاف ہو جاتا ہے۔

میں اِن دانشور اور ادیب اور عالم اور صوفی مولانا سے یہ پوچھتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں کہ جن لوگوں کو آپ نشانہ نوکِ قلم و نوکِ زباں بنا رہے ہیں اُن کے جمع کردہ اور تیار کردہ بیشتر افراد زیادہ سے زیادہ پہلوؤں میں مومن، عبادت گزار، معاملات کے دیانت دار اور دعوتِ حق کو پھیلانے کے لیے حُسنِ گفتار سے کام لینے والے ہیں۔ ہاں دعوت کے رُو سے وہ یہ بتاتے ہیں کہ اسلام

مقید و محکوم رہنے کے لیے نہیں، محرابوں اور منبروں سے باہر کا سارا میدان تگ و تاز بھی اس کا ہونا چاہیے، وہ کشمکش پیدا کرنے نہیں آیا، شاہد اور مجاہد پیدا کرنے آیا ہے، اس کے لیے تسبیحیں کافی نہیں، وہ اپنے قوانین کا نفاذ بھی چاہتا ہے۔ اس کے لیے ایسے لوگ ہی سرمایۂ اطمینان نہیں جو ایک طرف لوگوں کو کلمہ پڑھائیں اور دورے کریں۔ اور دوسری طرف سودی بینکوں سے سود بھی حاصل کریں، پردے کے بھی پیچھے اڑائیں، اسمگلنگ کو بھی روا رکھیں اور بھی جو چاہیں کریں، کلمہ سیدھا ہونا چاہیے۔

کسی کا یہ بتانا کہ یہ اسلام جو چاروں طرف سے زنجیروں میں بندھا پڑا ہے ــــ کچھ دشمنوں کی زنجیریں جو ہمارے اختیارات سے باہر ہیں، اور کچھ وہ زنجیریں جو خود ہم نے پہنا رکھی ہیں ــ وہ زخمی ہے، کراہ رہا ہے۔ اسے تفرقہ بازوں اور اختلافی نقطے چھانٹنے والوں نے کچوکے دے دے کر بے حال کر رکھا ہے۔ اور پھر بتانا کہ اصلاً یہ حکومتوں کا مالک ہے، اس کے سر پہ تاج ہونا چاہیے، اس کے پاؤں تخت پہ ہونے چاہئیں، اس کا سکہ رواں ہونا چاہیے ــــ اور اس کے لیے ہمیں اوّلاً اپنی اصلاح کرنی ہے۔ معاشرے کی تعمیرِ نو کا لمبا کام دھیرے دھیرے کرنا ہے، دنیا میں علمی و تحقیقی ذرائع سے اپنے حق میں رائے پیدا کرنی ہے، پھر کہیں جا کر ایک امکان پیدا ہو گا کہ حالات مختلف اطراف سے سازگار ہوں تو زخمی اسلام کی مرہم پٹی کر کے اور اس کی زنجیریں کھول کر اسے اُٹھا کھڑا کیا جائے اور وہ اپنے مقامِ برتر کی طرف مارچ کرے۔ مولانا! آپ سے کس نے کہا کہ دین کا جامع اور بلند تصور رکھنے والے معدودے سے لوگ جو پائے جاتے ہیں وہ اپنی ذات سے اسلام کو دور رکھتے ہیں اور تلوار لے کر دوسروں کے سروں پر جا کھڑے ہوتے ہیں کہ پڑھو کلمہ؟ حضرتِ مہربان! وہ کسی دین و اعتقاد کے ریاست کی سطح تک پہنچنے کے طویل عمل کو بھی جانتے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے پہلی ضرورت یہی تسلیم کرتے ہیں کہ انہیں خود اپنے اوپر اور اپنے گھر والوں پہ اسلام کو نافذ کرنا ہے۔

یاد رکھیے کہ دین نام ہے انسان کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں لانے کا!

آپ ذرا اپنے معتوب خادمانِ اسلام کی مشکل کا اندازہ اس لحاظ سے بھی کریں کہ ان کو زجر و توبیخ کرنے والے، طنز و تضحیک سے کام لینے والے اور کھلی کھلی مزاحمتوں اور مخالفتوں کی

حدیث ... کے سامنے تحریف کرنے والے بہت ہیں ۔ ان کی تین سپر نا کی قوتیں تو ہمارے ناقدین اور ... کی زیادتیاں سہنے میں بیدار ہوجاتی ہیں ۔

درخواست ہے کہ اسلام کی صحیح تعلیم کی پیروی کرنے والوں کو چھوڑ کر لادینیت ، سوشلزم اور مغربی سامراج اور نئی نسل میں یہودیوں اور برصغیر میں پائے جانے والے مغرب پرستوں کی طرف ذرا زیادہ توجہ صرف کریں ۔

[illegible] زلزلہ | مؤلف : قاضی شمس الدین درویش - ناشر : دارالعلوم حنفیہ ورکشاپی محلہ راولپنڈی ۔ اچھی طباعت ، دبیز ٹائیٹل - صفحات : ۴۸ - قیمت : ۵/۰ روپے

عنوان سے اندازہ ہوا کہ قدیم طرز کا مناظرانہ لٹریچر ہے اور خیال تھا کہ دو سطری تعارف کرا دیا جائے مگر پڑھا تو اس تحریر کی اہمیت سامنے آئی - ہر چند کہ ان چند اوراق میں ایک مخالفانہ تحریر کا جواب دیتے ہوئے دیوبندی اور بریلوی اختلافات کا ذکر آیا ہے - مگر اس انداز سے کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں کوئی حقیقی منافات نہیں - یعنی تطابق و توافق کا راستہ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ "تعارف" کے زیرِ عنوان قاری محمد امین لکھتے ہیں کہ "دیوبندی بریلوی نزاع سے خود اہلِ سنت ہی کو نقصان پہنچتا ہے" ۔ (ص - ۶) "حرفِ آغاز" کے صفحات میں مولانا شمس الدین صاحب نے انگریزی مساعئ تفرقہ انگیزی پر ایک طائرانہ بازگشت ڈال کر یہ واضح کیا ہے کہ بدیسی سامراج کے استحکام کے لیے بطورِ خاص مسلمانوں میں مذہبی تفرقہ انگیزی کی اسکیم پر کام کیا گیا - مولانا نے عہد بہ عہد شائع ہونے والے بحث انگیز مفلٹوں اور طوفان خیز کتابوں کا ذکر کیا ہے جو بطورِ خاص لکھوائی گئیں - اسی سلسلے میں مولانا نے لکھا ہے کہ مشہور کتاب "تقویۃ الایمان" (شاہ اسمٰعیل شہید) "انگریزوں نے مسلمانوں میں سر پھٹول پیدا کرنے کے لیے کسی کم علم دیہاتی مولوی سے گنواری اردو میں یہ کتاب لکھوائی ہے"[1] - جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن سے

---

[1] اس معاملے میں اتفاق کرنا مشکل ہے کہ تقویۃ الایمان شاہ صاحب نے نہیں لکھی اور اس کی زبان گنواری اردو ہے - ممکن ہے کہ کوئی اور جعلی کتاب اس نام سے لکھوائی گئی ہو -

تقویۃ الایمان کا انگریزی ترجمہ کروا کے دور دور تک پھیلا دیا۔" مسیحی مشنری جس کے عیسائیوں نے اس کتاب کی شہرت کو چار دانگ عالم میں پہنچانے کے لیے مشہور عربی لغت المنجد طبع بیروت میں اس کتاب کا ذکر شائع کیا۔ (ص ۱۰۶) مولانا زید ابوالحسن نے لکھا کہ "انگریزوں نے اس کتاب کو ہندوستان میں مفت بانٹا"۔ اس سلسلہ میں مولانا احمد رضا خان بریلوی کا یہ بیان بھی درج ہے کہ "اس کتاب کی نسبت حضرت اسمٰعیل شہیدؒ کی طرف صحیح نہیں ہے"۔ (ص ۱۰۹) مؤلف نے بتایا کہ انگریزوں کی خفیہ اسکیم کے نتیجے میں دیہ المفاظ بہار ۔۔۔ میں ۱۹ بیسویں صدی کے نصف تک مناظرانہ بحثوں سے متعلق ایک ہزار پمفلٹ شائع ہو چکے تھے۔ جن میں سے پانچ سو خود مولانا کے پاس موجود ہیں۔

اس پمفلٹ میں ایک صاحب کا "ارشد" کے نام سے ذکر ہے جن کی دھاندلیاں بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ علمائے دیوبند کی کتابوں اور تقویۃ الایمان سے عبارتیں اخذ کر کے قطع و برید کے ساتھ حوالے دیتے ہیں اور اس طرح فتنہ انگیزی کا سامان ہوتا ہے۔

عبارت اگرچہ بہت اچھی اور مؤثر ہے، مگر کہیں کہیں وہی مناظرانہ اسپرٹ کام کر جاتی ہے۔ مثلاً یہ فقرہ ملاحظہ ہو: "عامر (مراد عامر عثمانی مرحوم مدیر تجلی دیوبند) صاحب کا بے لاگ قلم حلال خور کا بے لاگ چھرا تھا، جو حلال و حرام دونوں پر یکساں چلتا تھا"۔ کہیں کہیں طنز بھی ہے مگر ادبیت کا رنگ جھلکتا ہے اور گہرا اتر جاتا ہے۔ مثلاً "ارشد صاحب کے ہاتھ کی صفائی" "ارشد صاحب کا ایک کانٹے دار پھیرا" یا "ارشد صاحب کے معطر شگوفے"۔

خلاصہ یہ کہ پمفلٹ کا رُخ صلاح و فلاح کی طرف ہے۔

اسے پڑھ کر ضرورت محسوس ہوئی کہ کاش کوئی مصنف یا اعلیٰ درجے کا طالب علم "انگریزوں کی تفرقہ انگیزی" پر برصغیر کے حوالے سے، تحقیقی مقالہ لکھے اور اس میں مناظرانہ لٹریچر اور مناظرانہ زبان و ادب کا جائزہ بھی لیا جائے۔ تاریخی مباحثوں اور مناظروں اور مباہلوں پر گفتگو ہو۔ اور بطور خاص قادیانیوں کا بھی ذکر آسکے۔

تحریکِ اسلامی کا خلاصہ

دو کتابوں میں سمیٹ دیا گیا ھے !

① تحریکِ اسلامی کی پہلی کتاب

از : سیّد اسعد گیلانی

② تحریکِ اسلامی کی دُوسری کتاب

از : سیّد اسعد گیلانی

- پہلی کتاب : بارہ مضامین اور بیسیوں امتحانی تبلیغی سوالات پر مشتمل ہے۔
- دوسری کتاب : تحریک کے دستور اور نصب العین سے لے کر تازہ ترین جدوجہد تک محیط ہے۔
- پہلی کتاب : قاری کا ہاتھ پکڑ کر انفرادی تصورِ دین سے اجتماعی زندگی تک لے جاتی ہے۔
- دوسری کتاب : اسلامی نظامِ جماعت کے ایک ایک جزو سے واقفیت فراہم کرتی ہے۔
- پہلی کتاب : دین کا مشن اور مشن کے تقاضے بیان کرتی ہے۔
- دوسری کتاب : تحریکِ اسلامی کی خصوصیات اور خصوصیات کے تقاضے بیان کرتی ہے۔
- پہلی کتاب : ہر نئے متعارف ساتھی کے ہاتھ میں دیں۔
- دوسری کتاب : ہر اس شخص کو دیں جس نے پہلی کتاب کا مطالعہ کر لیا ہے۔

دونوں کتابیں تحریکِ اسلامی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں جو سمتِ منزل رواں دواں ہیں۔

ان سے استفادہ کیجیے

پہلی کتاب : صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۵/- • دوسری کتاب : صفحات قیمت ۲۴/-

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ
اردو بازار - لاہور

اسلامی نظریۂ ادب

کیا ہے؟

اس کے خدوخال کیا ہیں

اس کا حدود اربعہ کیا ہے

اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

ڈاکٹر حمید اللہ صدیقی ● ڈاکٹر عماد الحق صدیقی

پروفیسر خورشید احمد ● جناب ماہر القادری

پروفیسر ہارون الرشید ● جناب آباد شاہ پوری

جناب نعیم صدیقی ● سید اسعد گیلانی

یہ نظریۂ ادب انقلابی نظریۂ توحید اور اخلاق پر قائم ہے۔

مرتب کرنے والے:

○ سید اسعد گیلانی

○ اختر حجازی

ضخامت: ۲۱۲ صفحات ○ قیمت: ۳۰/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور